

تحقیق

حیاتِ آخرت

(حیات بعد الہمات)

(انسانی سوچ و فکر کو درپیش ایک دائمی محمصہ)

الہامی رہنمائی اور جدید سائنسز کی روشنی میں  
ایک عقلی، منطقی، تقابلی جائزہ

از

اورنگزیب یوسف زئی

## فہرستِ ابواب

- ۱- پیش لفظ صفحہ ۲
- ۲- موضوع کا تعارف اور پس منظر صفحہ ۸
- ۳- دو باہم متضاد نظریات صفحہ ۱۳
- ۴- حیاتِ آخرت کی تعریف صفحہ ۱۶
- ۵- تحقیقِ آخرت از روئے قرآن صفحہ ۱۸
- ۶- تحقیقِ آخرت از روئے جدید سائنس صفحہ ۳۳
- ۷- حیات کی تخلیق و ماہیت پر ایک سیر حاصل تجزیہ صفحہ ۳۵
- ۸- کائنات اور شعورِ مطلق [خالق] صفحہ ۴۳
- ۹- توانائی [energy] اور شعورِ مطلق صفحہ ۴۸
- ۱۰- حرکت [motion] صفحہ ۵۸
- ۱۱- حیوانی وجود کی طبعی موت اور لافانی شعوری ذات صفحہ ۶۱
- ۱۲- اختتامیہ صفحہ ۷۲

## پیش لفظ

ہماری مذہبی دنیا میں حیاتِ آخرت کا حتمی تصور ایک انتہائی عیش و نشاط سے لبریز، خالص جسمانی زندگی کا ایک ثانوی، لیکن ہیٹھگی کی خصوصیات رکھنے والا، ایسا دور ہے جہاں کرنے کی لیے کوئی کام ہے نہ ذمہ داری، نہ جبر نہ پابندی۔ فقط آرام ہی آرام ہے۔ جنت کی ان گنت نعماء ہیں اور اسپر مستزاد، سدا بہار کڑیل جوانی۔ یعنی کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ پھر رہنے کو پر تعیش محلات، پینے کو شرابِ طہور، کھانے کو خوشبودار لحمِ طیور، اور لذتِ کام و دہن کے دیگر بیش بہا اور قوت بخش لوازمات۔ یعنی یہ عالم کہ بقولِ شاعر:

یہ عالم، یہ بت خانہ چشم و گوش جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمہ وقت تمتع کے لیے دستیاب، سدا کنواری، بلوریں جسم اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی مالک، جنت کی ترو تازہ حوریں۔ وہ بھی درجنوں نہیں بلکہ ستر ستر ہزار کی نفری میں۔ ہماری مقدس مذہبی پیشوائیت کے لیے یہ آخری نعمت کیونکہ تمام تر تگ و تازہ حیات کا منتہاء و مقصود ہے، لہذا یہاں ذرا رُک کر ایک شعر پیش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

امید خور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو یہ حضرت دیکھنے میں بھولے بھالے سیدھے سادھے ہیں

پھر، دائمی موسمِ بہار، مستقل پکنک کا سماں، نہروں کے کنارے باغات در باغات، خیموں کی قطاریں، ٹھنڈا گھنا سا یہ، دودھ اور شہد کی بہتی ندیاں۔ متقین کے پاکباز دلوں میں پیدا ہونے والی ہر ممکن و ناممکن خواہش کی چشمِ زدن میں جسم شکل میں تعمیل، خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد حسین، خوب رو اور کمسن اغلام اور مصاحبت کے لیے فرشتے۔ سونے چاندی کے منقش پیالے، ریشم حریر و بروکئیڈ کے اعلیٰ لباس، آرائش کے لیے موتی نکلے سونے کے لنگن، سچی ہوئی آرام دہ شاہی نشستیں وغیرہ وغیرہ۔ اور جوانی کے گزر جانے کا موہوم سا اندیشہ بھی ناپید۔ اور اس حسرتِ ناتمام سے مکمل نجات جو عدم کے اس شعر سے ہویدا ہے:

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹی نہیں جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

غرضیکہ تصور کی پرواز، مادہ پرستی کی اساس پر مرتکز، خون و گوشت سے بنے جسم کی دوبارہ بازیافت اور جسمانی لذتوں کے

حصولِ نو کی خواہش سے ذرا بھی بلند نہ ہونے پر مصر ہے۔ کاش کہ سب کچھ ایسے ہی وقوع پذیر ہونے کی کوئی گنجائش ہوتی، تاکہ حضرت صاحبان کی تسکینِ قلب و جاں کا سماں، اور بعد از مرگ صنفِ نازک کی صحبتِ جاناں سے محرومی کے درد کا درماں ہو جاتا۔ مگر وائے افسوس کہ ایسا نقشہ کسی طور نظر نہیں آتا۔ روایتوں کی بھول بھلیوں میں گم، دیو مالائی افسانوں کے تخیلاتی پیکروں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے

آخرت کا سامنا ایک شدید دھچکے اور عظیم صدمے کا موجب ہوگا۔ گمان غالب یہی ہے کہ زبانِ حال سے بے ساختہ پکار پکار کر گریہ کر رہے ہوں گے کہ:

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے  
 دراصل صدیوں کے انسانی تجربات کی رُو سے زندگی کی اصل و حقیقت روایات کی دنیا سے یکسر مختلف و متضاد ثابت ہوتی ہے۔

معزز قارئین، الہامی صحیفہ آخر میں، آیات ۲۶/۵۵-۲۷ کے حوالے سے جب یہ فرمایا گیا کہ [کل من علیہا فان، ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاكرام]، تو اس ارشاد باری تعالیٰ کے ذریعے دراصل یہ یاں بھری حقیقت بیان کی گئی کہ [زندگی کی جو بھی شکل اس زمین پر اپنا وجود رکھتی ہے، وہ بالآخر فنا کے گھاٹ اترنے والی ہے، جب کہ بقاء صرف تیرے پروردگار کی لافانی ذات کے لیے ہے، جو صاحبِ جلال واکرام ہے]۔

رب ذوالجلال کو تو اس مقام پر غالباً اپنی ذاتِ عالی مقام کی حقیقت بیان فرمانا مقصود تھا، جو اُس مالکِ کون و مکان نے خالق و مخلوق کی حیثیتوں کا تعین فرماتے ہوئے ایک خاص نکتہٴ تقابل کے پیرائے میں بیان فرمادی۔ تاہم یہ حقیقت حضرت انسان کی چشمِ بصیرت کے سامنے حسرتوں اور محرومیاں کا ایک لامتناہی دشتِ ویراں کھول گئی۔

کیا واقعی انسان کو ایک خود آگاہ و باشعور زندگی اس لیے عطا ہوئی ہے کہ وہ ہر آن و ہر ساعت ایک پرہول انجام سے خوفزدہ، ایک بے مقصد عمر بسر کرے جس کی منزل مقصود [لا - nihilism] یعنی فنا کے نا تمام اندھیرے ہوں؟ کیا نوعِ انسان وہی ذاتِ بے وقعت ہے جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ: [ہم جو تار یک را ہوں میں مارے گئے]؟۔۔۔ ایسا کچھ تو اُس ذاتِ رحیم و حکیم سے متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ کہ ایسا ہی کچھ تو زندگی کے بارے میں اس زمین پر موجود ہمارے مادہ پرست ساتھیوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد بھی باور کرتی اور برملا اظہار کرتی ہے۔ یعنی زندگی کا انجام فنا ہے، اور مادے کا انجام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر بے جان مادے میں مل جانا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر ایک تو اتر کیسا تھ آسمانی ہدایت نامے اور ضابطہ ہائے کردار کا نزول کس لیے؟ عظیم انسانوں کا مصلحین کے رُوپ میں مبارک ورود کس غرض سے؟ کیسی نیکی اور کیسا ایثار؟ کیسا اخلاق، رشتہ و پیوند، اور کون کس کا جان نثار؟ کس کام کی محبت، انسانیت، اصول پرستی، امن و آشتی اور پیار؟ یہ تو وہ انجام ہے جو سراسر ایک خود غرض زندگی، نفس پرستی کی روش اور میسر وقت کی محدود گھڑیوں سے ضمیر کی پروا کیے بغیر بھرپور لطف اندوزی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور تمام تر متفقہ عالمی اقدار، اور اخلاق عامہ کے سارے مسلمہ اصول و قوانین سب باطل ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر یوں کہ [بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست]!

لیکن پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ارشادِ بانی، بحوالہ آیت ۱۰۰/۹، میں کچھ خاص لوگوں کے بارے میں یہ خوش کن خبر سناتا ہے کہ ”وہ جو اللہ کے مشن کی تکمیل میں سبقت لینے میں پہل کر گئے، وہ جو ہجرت کرنے والوں اور ان کے مددگاروں میں سے تھے، اور وہ بھی جنہوں نے احسان [voluntarily] کے انداز میں ان کی متابعت کی، اللہ تعالیٰ ان کے کردار سے رضامند ہوا اور وہ اللہ کی رضا میں خوش ہوئے، اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں، اور جن میں وہ ہمیشہ رہینگے۔ یہی تو عظیم کامیابی ہے۔“

اسی طرح عظیم قرآنی فلاسفر حضرت علامہ اقبال نے بھی فرمایا کہ:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں  
 تو مایوسی و محرومی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی روشنی پھوٹ پڑتی ہے اور خزاں رسیدہ سوچیں آمد بہار کی توقع سے جاگ اٹھتی ہیں۔  
 اعمال صالحہ کی شکل میں بقائے حیات دُور ایک مینارہ نور کی طرح نظر آنے لگتی ہے، اور زندگی کی تمام خوشگوار قدریں انسان کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہیں۔ آسمانی ہدایت کا نزول اور پیغمبروں کی آمد کا جواز سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اُس مرحلہ شعورِ ذات کی وجہ تخلیق آشکار ہونے لگتی ہے جس مرحلہ عالیہ پر انسانی زندگی کو فائز کیا گیا ہے۔

- - -

معزز قارئین، الہامی صحیفے کے درج بالا حوالہ جات اور حضرت علامہ کے فلسفیانہ کلام کی ایک جھلک (touch) سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ یہ تحریر کسی ماقبل سوچے سمجھے یا اندھے عقیدے کی پیروی میں لکھی جا رہی ہے، اور اس سبب سے قبل از تحقیق ہی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ حیاتِ آخرت ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ، جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ موضوع کو تمام تر لکھے گئے مواد کی مدد سے عقلیت پسندی (Rationalism) کے معیار پر سمجھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ تحقیق کی جائے کہ حضرت علامہ کی فکرِ عمیق نے جب یہ آواز بلند فرمائی کہ:

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

تو انہوں نے ”جوہرِ انساں“ کی معنی خیز اصطلاح کس فلسفیانہ پیرائے میں استعمال فرمائی۔ یہ ”جوہر“ دراصل انسانی زندگی کے کس عنصر [element] کو کہا گیا۔ عدم اور فنا جیسے قطعی الفاظ سپردِ قلم کرنے وقت علامہ صاحب کی انسان شناس نظر، زندگی [life] کے کس پہلو کی کس حقیقت پر مرکوز تھی۔ اور جب قرآن حکیم جیسا معتبر اور مکرم صحیفہ، انسان کو ہمیشگی کی بشارت دیتا ہے تو کیا واقعی وہ ایک ایسے مرحلہ حیات کی بات کرتا ہے جہاں عرصہ حیات اس مادی زندگی کے تقابل میں کہیں طویل یا دائمی حیثیت کا حامل ہوگا۔ اگر ایسا ہے، تو یقیناً وہ آئیوالا مرحلہ زندگی طبعی یا جسمانی زندگی ہی کا ایک اور دور ہرگز نہیں بلکہ کسی اور نوع، یا کسی یکسر مختلف اندازِ حیات کا حامل ہوگا۔ کیونکہ



پناہ بخدا! جس مرحلہ تفکیر پر علامہ اقبالؒ جیسا بلند پایہ، عدیم الظہیر اور ہمہ گیر نابغہ، جو خود کو عمر بھر کی فلسفیانہ آبلہ پائی کے تناظر میں ”محرم راز درونِ مے خانہ“ کی صفت سے متصف فرماتے تھے، اپنے دور کے علماء و فضلاء کو اسراہستی سمجھانے سے عاجز پاتے اور خود کے لیے نفسِ جبریل کی آرزو کرتے تھے، تو ہاشما کی کیا مجال کہ اصل حیات کو اس پیرایے میں پیش کر پائے کہ وہ ادراک کے نہاں خانوں کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ معزز قارئین، حضرت علامہ نے دراصل اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ نفسِ ناطقہ چند مخصوص امور کی تشریح و توضیح کے ضمن میں خود کو ایک حد سے آگے مجبور و بے بس پاتا ہے۔ انہیں اپنے باطن میں ہی مستور رکھنے پر مجبور ہے۔ شاید اس لیے کہ عمومی سطح پر زندہ انسان کا شعور اپنے تمام تر تحصیلِ علم کے باوجود ہنوز اپنے تکمیلی سفر کی رہگزر میں ہے اور کاملیت کی حد سے بہت دور۔

اگرچہ صحائف ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ حیاتِ آخرت ایک حقیقت ہے اور انسانوں کی اکثریت ان پر یقین بھی رکھتی ہے، لیکن جوں جوں آپ اس مطالعے میں قدم آگے بڑھائیں گے، یہ حقیقت از خود آشکار ہو جائیگی کہ حیاتِ آخرت کے الہامی اور مادی دونوں نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اور دونوں ہی کے موافق اور مخالف پیش کیے گئے دلائل اور ثبوت غیر جانبدارانہ انداز میں زیرِ تحقیق لائے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں، صحیفہ آخر، یعنی قرآن سے حوالہ جات کے ساتھ ساتھ، فزکس، بائیولوجی اور علمِ نفسیات کے دریافت شدہ مسلمہ قوانین کی بھرپور مدد سے بھی بات واضح کرنے کی پوری کوشش بروئے کار لائی گئی ہے تاکہ مضمون ہر طبقہ خیال کے لیے کشش کا باعث ہو اور غیر جانبداری کا نمونہ قرار پائے۔ اگر قارئین سائنس کے عنوان کے تحت آئیو الے انتہائی ٹھوس، مدلل، منطقی، لیکن قدرے طویل اور خشک نظر آنے والے مواد کو اپنا قیمتی وقت عطا فرمائیں گے، تو اس ناچیز کا دعویٰ ہے کہ فلسفہ تخلیق و فلسفہ حیات کو سمجھنے میں جہاں جہاں، جس بھی سطح کی تفنگی اب تک پائی جاتی تھی اس کا یقینی مداوا ممکن ہے، اور یہی اس ناچیز کی خامہ فرسائیوں کا منتہی و مقصود ہے۔ یہی وہ میدان ہوگا جو حیاتِ آخرت کو اس کی حتمی حدود تک واضح کرتے ہوئے صدقِ بسیط کی سمت تسلی بخش راہنمائی کی راہ کھول دے گا۔

اس تحریر کے پیش نظر وہی ٹھوس اسلوبِ بیان ہے جو اذہان میں اٹھنے والے سوالات کا تسلی بخش انداز میں جواب دیتا جائے اور آخر کار قاری کے لیے اپنا حتمی اور یقینی فیصلہ کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ نہ کہ ایک فکری مخمضے میں الجھا چھوڑ جائے۔ تو آئیے قارئین آگے بڑھتے ہیں اور موضوع کے تفصیلی تعارف سے اس دلچسپ و عجیب، اور بادی النظر میں دیومالائی نظر آنے والے موضوع پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ واللہ المستعان۔۔۔

## موضوع کا تعارف اور پس منظر

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

حضرت انسان اپنی برتر تخلیقی (یا ارتقائی) سطح پر ایک طبعی وجود (physical organism) کے ساتھ رہتا ہے، جس کے جبلی محسوسات میں زندگی کے تحفظ اور بقا کا شدید خود کار جذبہ بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ اپنی فطرت طبعی کی رو سے موت کے لئے برضا و رغبت ہرگز آمادہ نہیں ہوتا۔ زندگی کے تحفظ اور بقا کی خواہش مرتے دم تک اپنا تسلط برقرار رکھتی ہے۔ یہ حقیقت بھی متفقہ علیہ ہے کہ یہ حضرت ایک شعوری وجود بھی رکھتا ہے جو تصوراتی پیکر (ideals) تراشتا رہتا ہے۔ اور وہ ان تصوراتی پیکروں کی تقلید کرتا اور ان سے محبت اور ان کی پرستش کرتا ہے۔ انسان کے اندر پایا جانے والے ہیرو وورشپ [hero worship] کا کھلا رجحان اسی آئیڈیلزم کا شاخسانہ اور واضح ثبوت ہے۔ کیوں کہ ان پیکروں کی قابل رشک صفات میں موت پر فتح۔۔ اور ہمیشگی۔۔ کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں، اس لیے حضرت انسان کے نفس میں بھی ہمیشگی کی نہ ختم ہونیوالی خواہش موجود رہتی ہے۔ انسانی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ صاحبان قوت و اختیار نے زندگی کے دوام اور موت کے ورود کو شکست دینے کیلئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف تہذیبی ادوار میں انسانی اجسام کو بعد از مرگ حنوط کرنا اور انہیں دنیاوی ساز و سامان کے ساتھ محفوظ مقامات پر با احتیاط رکھ دینا بھی اسی انسانی خواہش کے تاریخی تقاضے کا ثبوت ہیں۔

فلسفے، مذاہب، دیومالاؤں اور فلشن میں آخرت، یا حیات بعد الممات، ایک ایسی انجانی اقلیم کا تصور ہے جو خواہ جسمانی سمجھی جائے یا روحانی، جس میں ایک ذات کی شناخت اور شعور، اس کی عمومی زندگی کے گزرنے کے بعد، اس کے جسم کی موت کے بعد بھی، زندہ رہتے ہیں۔ آخرت کے متعدد نظریات کے مطابق، ایک ذات کا وہ لازمی ہیولا جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، اس کی ذات کا کوئی جزوی عنصر بھی ہو سکتا ہے یا اس کی مکمل روح بھی، جو اس کے ساتھ اگلے مرحلے میں صعود کرتی ہے اور اسے شخصی یا ذاتی شناخت دیتی ہے۔ حیاتِ آخرت پر یقین، جو فطری شکل بھی رکھ سکتا ہے اور فوق الفطری یعنی روحانی تصور بھی، ہمیشہ دائمی فنا کے نظریے کی ضد یا اس کے برعکس ہوتا ہے۔

کچھ قابل قبول نظریات کے مطابق، جسمانی موت کے بعد از سر نو جاری ہونے والی زندگی اکثر ایک روحانی دنیا میں وقوع پذیر ہوتی ہے اور کچھ دوسرے پسندیدہ نظریات کے مطابق، یہ دراصل انسانی ذات کی اسی دنیا میں پیدائش نو کو کہتے ہیں جہاں زندگی کا سفر ایک بار پھر شروع ہوتا ہے، امکانی طور پر کچھ اس انداز میں کہ انسان نے جو کچھ اپنے ماضی میں کیا ہوتا ہے اس کی کوئی یادداشت اس کے دماغ



میں محفوظ نہیں ہوتی۔ اس موخر الذکر نظریے کی زو سے ایسی پیدائشِ نو اور اس سلسلے سے جڑی اموات بار بار بھی واقعہ ہو سکتی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ ذاتِ روحانی دنیا میں داخلے کے لیے مطلوبہ معیار حاصل نہ کر لے۔ حیات بعد الممات سے متعلقہ زیادہ اہم سمجھے جانے والے نظریات دراصل اپنے ماخذاتِ مذاہب، روحانیت یا باطنی اور صوفیانہ علوم میں رکھتے ہیں۔

کچھ مذہبی سلسلوں میں، جیسے کہ وہ سلسلے ہیں جو حضرت ابراہیم کی نسل [posterity] سے جڑے ہیں، یہ مانا جاتا ہے کہ مردے ایک مخصوص حالتِ وجود میں منتقل ہوتے ہیں جس کا تعین ایک خدا، یا خداؤں، یا دیگر الہامی فیصلوں کے ذریعے ہوتا ہے، اور ان فیصلوں کی اساس وہ اعمال اور عقائد ہوتے ہیں جو مرنے والے نے طبعی زندگی کے دوران انجام دیے ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دوسری باریکی طبعی زندگی کے نظریے میں، جیسے کہ دھارمک روایتوں میں پایا جاتا ہے، جاری رہنے والی زندگی کی نوعیت کا تعین براہِ راست اس ذات کے اعمال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو اس نے ختم ہو جانے والی زندگی میں انجام دیے ہوتے ہیں، نہ کہ کسی دوسری ذات کی صوابدید پر۔

البتہ جتنی بھی تہذیبیں تاریخ کے مختلف ادوار میں کرہ ارض پر عروج و زوال کے دائروں سے گزری ہیں یا ابدی ہلاکت کا شکار ہو کر معدوم ہو چکی ہیں، ان سب میں حیات بعد الممات کے تصور کی موجودگی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔

قارئین گرامی قدر، آخر ایسا کچھ تو انسان کے باطن کی گہرائیوں میں موجود ہے جو اسے زندہ رہنے کی شدید خواہش دیتا ہے۔ اور انسان کیونکہ ہنوز اپنی ذات کی تعمیر کے مراحل سے گزر رہا ہے اور اپنی شعوری تکمیل سے ابھی بہت دور ہے، اس لئے وہ اپنی ذات کے اس تقاضے کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھ نہیں پاتا۔ شاید انسانوں کی ایک بڑی تعداد خود کو ابھی تک ایک مادی پیکر ہی کی شکل میں شناخت کرتی ہے، اور مادے نے تو بالآخر فنا ہو کر مادے میں مل جانا ہے۔ تو پھر وہ کیا چیز ہے جو انسان کو ہمیشہ زندہ رہنے کی تڑپ اور تصور دیتی ہے؟ ابراہیمی مذاہب کے الہامی فلسفے کی رو سے تو وہ چیز انسانی روح ہے جسے موت نہیں آتی، اور جو اسکے طبعی مادی جسم کی موت کے بعد ایک دوسرے اور بلند تر درجے میں منتقل ہو کر زندہ رہتی ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں جو فطری سوالات انسانی اذہان میں ابھرتے ہیں ان کی نوعیت کچھ اس طرح ہوتی ہے:-

(۱) کیا واقعی موت ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانے کا نام ہے؟

(۲) یا کیا انسانی زندگی درحقیقت موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے؟

(۳) اگر حیاتِ آخرت کا وجود ہے تو اس کی کیا شکل ہے؟

- (۴) کیا وہ مادی حیات ہے، یا غیر مادی، خاکی ہے یا نوری؟
- (۵) کیا ہمارے پاس آخرت کی زندگی کو ثابت کرنے کے لئے ٹھوس حقائق موجود ہیں؟
- (۶) کیا وہ حقائق ہمیں آسمانی صحیفوں سے ہی ملتے ہیں، جن پر آج دنیا کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ یقین نہیں رکھتا؟
- (۷) کیا وہ حقائق ہمیں سائنس یعنی فزکس اور بایولوجی اور علم نفسیات سے بھی ملتے ہیں جن کو آج سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے، اور جن کی ثقاہت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا؟

ان سوالات کے جوابات کچھ اس طرح دیے جاسکتے ہیں کہ:

- (۱) ہاں، موت واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانے کا نام ہے، لیکن صرف اس ذات کی فنا کا جو خالص طبعی حیوانی وجود رکھتی ہے۔ اور یہ امر عمومی مشاہدے اور تاریخی تجربے سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حقیقت غالباً تمام نقطہ ہائے نظر کی رُو سے متفق علیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
- (۲) انسانی زندگی کی اصل و بنیاد تو شعور (consciousness) ہے جو انسان کی ذہنی زندگی (mental life) کا دوسرا نام ہے، اور ایک خود آگاہ شعوری ذات کبھی فنا نہیں ہوتی کیونکہ وہ غیر مادی (non-material) وجود رکھتی ہے۔ یہاں کسی قدر اختلاف کی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے اور اس اختلاف کو دور کرنے کیلئے یہ نقطہ پوری تفصیل سے زیر بحث لایا جائیگا۔
- (۳) شعوری ذات (روح) ہی حیاتِ آخرت یعنی اگلے بلند تر مرحلہ حیات میں داخل ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ جو ایک غیر مادی سطح یا مرحلہ (stage) ہے۔

- (۴) شعور یا انسانی ذہن (mind) ایک غیر مادی وجود رکھتا ہے اس لئے اسے آپ نوری یا سائنس کی زبان میں تو انائی (energy) کی ایک خاص قسم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور سائیکولوجی کی اصطلاح میں (conscious self)۔ اس لیے متفقہ طور پر اسے مادی یا خاکی نہیں کہا جاسکتا۔

- (۵) ہمارے پاس علم میں بے پناہ ترقی کے باوصف ایسے ٹھوس حقائق موجود ہیں جو حیاتِ آخرت کا وجود ثابت کر سکتے ہیں۔
- (۶) وہ حقائق ہمیں آسمانی صحیفوں سے بھی ملتے ہیں، جنہیں آخری صحیفے یعنی قرآن کے حوالے سے آپ کے سامنے پیش کر دیا جائیگا۔ ان حقائق کو آج کے ترقی یافتہ دور کا جدید مادیت پرست (materialist) انسان درخور اعتناء نہیں سمجھتا کیونکہ وہ بوجہ الہامی صحائف پر ایمان نہیں رکھتا۔

- (۷) اور وہ حقائق ہمیں سائنس سے بھی ملتے ہیں، جنہیں جھٹلانا بہت ہی مشکل کام ہوگا، کیونکہ ایسے حقائق کے رد کیلئے کوئی اور، عمومی سطح پر قابل قبول، اور برتر سند دستیاب نہیں۔

یہ سب سوالات و جوابات ہم آئندہ صفحات میں ایک خاص ترتیب میں ثبوت و دلائل کے ہمراہ زیر بحث لائیں گے۔ لیکن وہ سوالات جو اس کے بعد بھی تشنہ جواب رہینگے، وہ ہیں:-

[۱] حیات دراصل کیا ہے؟

[۲] حیاتِ انسانی کا مقصد کیا ہے؟

[۳] کائنات اس تناظر میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟

[۴] مادے، حرکت، توانائی، اور شعور کن چیزوں کے نام ہیں اور یہ کس سطح پر کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

[۵] حیاتِ آخرت کے تناظر میں ہم ان سب کو کس شکل میں دیکھتے ہیں؟

قارئین، ان مشکل سوالات کے جوابات ہمیں سیر حاصل طور پر ہمارے سائنسی جز میں زیر بحث آتے ہوئے نظر آئیں گے اور آپ ایک قیمتی مطالعے کے بعد حقیقتِ مطلق کو عین الیقین سے دیکھ پائیں گے۔ یا کم از کم اس عاجز کو اپنی ناچیز کوششوں کے نتیجے میں ایسی امید ضرور ہے۔

حضرت انسان تخلیقی پلان کی جس سطح پر پیدا کیا گیا، یا مادی نظریات کے مطابق جس ارتقائی سطح پر معرض وجود میں آیا، اس سطحِ زندگی میں جس نمایاں ترین عنصر کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ حقیقت کو جاننے کا ایک موروثی تقاضہ اور انمٹ پیاس ہے، جو تخلیق کار نے، یا عملِ ارتقاء نے، اس کے خمیر میں ودیعت کر دی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے نہ روحانیت پرست انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی مادیت پرست۔

پس انسانی تہذیب کی صحیح نوظلوع ہوتے ہی جو پہلا سوال ذہنِ انسانی پر نقشِ پائیدار کی مانند ثبت پایا گیا وہ تقاضا علم و آگہی تھا۔ اس زمین پر ہوش سنبھالتے ہی انسان ایک تسلسل سے اپنے ماخذ کو جاننے اور اپنی منزل مقصود کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ زمین پر اپنی زندگی کی حقیقت کو اور اس کے مقصد کو جاننا چاہتا ہے۔ اسی تلاش نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے ارد گرد نظر ڈالے اور اس کائنات کی حقیقت اور اہمیت کو جاننے کی جستجو کرے۔

کائنات کی حقیقت جاننے کیلئے انسان نے بے شمار نظریات سے کام لیا۔ اس نے دراصل کائنات کو اپنا آئیڈیل تصور کر لیا اور اسکے اسرار جاننا اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا۔ پس انسانی تاریخ فی الحقیقت اس کے آئیڈیلز کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے۔ کیونکہ آئیڈیلز (مثالی پیکر) دراصل انسانی سوچ و فکر ہی کی پیداوار ہیں اور انسانی ذات سے علیحدہ، یا ماوراء، کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ دراصل انسانی شعور کے ارتقاء کی، یا انسانی ذات سے متعلق ہمہ وقت وسعت پذیر علم و آگہی کی تاریخ ہے۔

اسی ارتقاء پذیر انسانی فکر کیلئے حیاتِ آخرت کا مخصوص ایک فوق الفطرت نظریے کی حیثیت سے ایک لائیکل سوال کی شکل میں سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور علم و عرفان کے نئے پراسرار ابواب کھولنے کی دعوت دیتا ہے۔

حیاتِ آخرت کا اثبات لازمی طور پر ایک خالق کے وجود کے اثبات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اگر حیاتِ آخرت کا کوئی وجود ہے، تو ایک لافانی اور لامحدود قوت کا وجود بھی لازم ہے جو صرف حیاتِ آخرت کے مرحلے کا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات اور اس میں کارفرما زندگی کی تمام اشکال و ہیات کا بھی خالق ہے۔ لامحالہ حیاتِ آخرت کی بحث خالق کے وجود کی بحث پر بھی منتج ہوگی۔ نیز اس ضمن میں طبیعی حیات اور موت کی حقیقت بھی زیر بحث لانی ہوگی۔

درپیش مہم طویل اور پر صعوبت ہے، لیکن آئیے قارئین، احتیاط کے ساتھ، قدم بقدم آگے بڑھتے ہیں۔

## دو باہم متضاد نظریات

ہر چند کہ ہوشیار حد تک گفتگو بنتی نہیں ہے مادہ و ساغر کہے بغیر

تاریخ کا بظہر غائر مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی شعور نے زندگی کے بارے میں اب تک عموماً دو بڑے اور اہم مکاتب فکر کا اتباع کیا ہے۔ ایک بڑے مکتب فکر کے مطابق، جو کہ جدید سائنسز پر مبنی ہے، انسان خالص مادہ ہے۔ اور اپنی طبعی زندگی گزار کر مادے ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔ یعنی بقول شاعر:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے، اسی ترتیب کا بگڑ جانا۔

اور:

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

اسی لیے اس مکتب فکر کے مطابق کائنات کی حقیقت بھی مادے کے سوا کچھ نہیں جو کہ بنا کسی مقصد یا منصوبے کے اپنا وجود رکھتا ہے۔ زندگی طبعی انتخاب (یعنی natural selection) کے نتیجے میں، اور کامل ترین کی بقاء (یعنی survival of the fittest) کے اصول کے تحت ارتقاء پاتی ہے۔ اس سوچ کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسان کے بلند تصوراتی پیکر (ideals) کوئی معنی نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ انسانی زندگی کے حیوانی پہلو کو برقرار رکھا جائے اور حیوانی نوعیت کے تقاضے اور وظائف ادا کیے جاتے رہیں۔ کیونکہ یہ مکتب فکر تخلیق کو، اور اس کے قرنہا قرن سے بتدریج بلند ہوتے ہوئے مدارج کو، تسلیم نہیں کرتا اس لیے لامحالہ خالق کے وجود سے بھی انکاری ہے (Atheism)۔ اسی نظریاتی اساس پر وہ حیاتِ آخرت کے وجود سے بھی متفق نہیں، یا اس کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہے (Agnosticism)۔

لیکن قارئین، اس نظریے کی بنیادیں خود سائنس کی ترقی نے ہلا کر رکھ دیں۔ بیسویں صدی کے ظہور کے ساتھ ہی مادے کا تصور ایک جوہری تبدیلی کا ہدف بن گیا۔ سائینسدانوں نے یہ قبول کیا کہ مادے کی حقیقت دراصل بجز توانائی [energy] کچھ اور نہیں ہے اور مادہ دراصل ایک ٹھوس بہروپ ہے جو توانائی نے اختیار کر لیا ہے۔ مزید برآں، مادہ اس لیے بھی توانائی ہے کہ انسانی وجود سمیت اس کائنات کا ہر ذرہ مسلسل حرکت [motion] پذیر ہے، اور جہاں حرکت ہو وہاں توانائی کا ہونا لازمی ہے۔ اب یہ سوال کہ آیا اس کائنات کی حقیقت صرف مادہ ہے یا صرف توانائی، یا پھر ایک انتہائے شعور، یا ایک عظیم شعوری ذات، تو اس کے جواب کیلئے ہمیں ابتدا پھر اس سوال سے کرنی پڑے گی کہ یہ کائنات اپنی مکمل شکل میں کیسے عالم وجود میں داخل ہوئی۔

البتہ توانائی کی دریافت کے روز اول ہی سے یہ حقیقت تسلیم کرنی لازم ہو گئی کہ مادیت پرستوں کا انسانی زندگی کے بارے میں خالص مادی ٹہرائے جانے کا نظریہ بہر حال باطل ہے۔ تو اب مادیت کی بحث کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے ہمیں

چند نکات پر سیر حاصل تبصرے کی ضرورت پڑے گی، جن میں سے ایک نکتہ تو یہ ہے کہ اگر مادہ دراصل توانائی ہے تو پھر توانائی کیا ہے؟ سائنس اس ضمن میں ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف ہے اور ”مستحکم انرجی“ [stable energy] اور ”بلیک انرجی“ [black energy] کی قسم کی اصطلاحات ایجاد کی جا رہی ہیں جو توانائی کی یا کائنات کی حقیقت ٹھہرائی جاسکیں۔ خاص طور پر انسانی حیات کے ضمن میں مادے اور توانائی کی بحث ہمیں کس فیصلہ تک پہنچاتی ہے۔ لامحالہ ہمیں حیاتِ آخرت کے ضمن میں ان سوالات کو زیر بحث لانا ہوگا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اسے پیدا کرنے والا کون ہے؟ آیا کہ اس کائنات کے وجود کے ماوراء کوئی زندہ وجود ہے جس نے مزید ذیلی زندگی پیدا کی؟ جب زندگی نے کئی سابقہ مراحل کے بعد انسانی پیکر اختیار کیا تو وہ کن اجزاء سے تشکیل پائی اور وہ اپنی بہت ترکیبی میں کس طرح حیات کی دیگر اشکال سے مختلف ہے؟ نیز موت کا سر نہاں کیا ہے؟ یہ کائنات کیوں وجود میں آئی؟ کیا تمام تخلیقی عمل میکینیکل اور خود کار ہے یا کسی مربوط پلان پر مرحلہ وار عمل درآمد کا نتیجہ ہے؟

اس کے برخلاف دوسرا مکتب فکر ہے جو صحائف کا پیرو کار ہے اور صحائف کی تعلیمات کے مطابق کائنات کو ایک تخلیق کے طور پر مانتا ہے۔ تخلیق کے پیچھے ایک خالق کے عظیم وجود کو تسلیم کرتا ہے جس نے انسان کو اپنی فطرت پر یعنی اپنی صفاتِ عالی سے آراستہ فرما کر پیدا کیا۔ [فطرت اللہ التي فطر الناس علیہا - ۳۰/۳۰]۔ اقبال کی شعری تشریح نے اس امر کی یوں تصدیق فرمائی:

خاکِ ونوری نہاد، بندہ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

آخری مکمل ترین صحیفے، قرآن کے مطابق موت و حیات کا دائرہ اس لیے تخلیق کیا گیا کہ انسان کو حسین تر اعمال کے

ذریعے اس کی ذات کی نشوونما کے مواقع فراہم کیے جائیں [الذی خلق الموت و الحیات لیبلوکم احسن عملا۔

آیت ۲/۶۷]۔ اقبال کا یہ شعر غالباً اسی آیت مبارکہ کی تفسیر میں کہا گیا:

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اسے ایک بہتر طرز زندگی گزارنے کے لیے انبیاء کے ذریعے دائمی ضابطہ کردار عطا کیا گیا [ذلک الكتاب لا ریب

فیہ ہدی للمتقین . آیت ۲/۲]۔

انسانوں کی تمام انواع کو، بلا لحاظ چھوٹا یا بڑا، کمزور اور طاقتور، تہذیب یافتہ یا غیر مہذب، الہامی ضابطہ کردار کی اطاعت کا

مکلف قرار دیا۔ [ما خلقت الجنّ و الانس الا لیبعدون . ۵۱/۵۶]۔

کائنات کی تخلیق کا یہ مقصد متعین کیا گیا کہ انسانوں سمیت ہر زندہ مخلوق کو اس کی محنتوں اور کاوشوں کا پورا پورا اور جائز اجر

مل سکے اور ان میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے [خلق اللہ السموات و الارض بالحق و لتجزی کل نفس بما

کسبت، و هم لا یظلمون. آیت ۲۲/۴۵]. یعنی یہ صریحاً واضح کیا گیا کہ کائنات اپنے وجود میں کوئی علیحدہ اور خود مختار تخلیق نہیں بلکہ تخلیق کیا ایک مربوط سلسلے سے جڑی ہے اور بلند ترین مرحلے پر موجود انسان کی ضروریات اور مقاصد کو پورا کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔

اسے آزادی اور بہترین صفات عطا کی گئیں [لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ آیت ۴/۹۵] تاکہ وہ خالق کے انسانیت کی فلاح کے مقاصد کے لیے کام کر سکے اور اس دنیا کو حجتِ ارضی میں تبدیل کر دے جہاں دکھ، افلاس، ظلم اور احتیاج باقی نہ رہے۔

تمام اعمالِ حسنہ کے اجر کے طور پر اسکو پیشگی کی زندگی اور برتر درجہ میں منتقلی کا وعدہ فرمایا گیا۔ الہامی ہدایت کی خلاف ورزی میں زندگی گزارنے والوں کو اسی اگلے درجہ حیات میں سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔ [بحوالہ متعدد آیات]۔ یہ بھی واضح فرمادیا گیا کہ یہ دنیاوی زندگی دراصل ایک امتحان گاہ ہے جس میں پیش کی گئی کارکردگی کا نتیجہ حیاتِ آخرت میں رو بہ عمل ہوگا۔

انسان کی موجودہ زندگی مادے اور روح کا ایک باکمال امتزاج ہے۔ وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ مادے کی آلائشوں سے پاک ہو کر ایک نئے مرحلہ زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ ایک بلند تر اور ارفع و اعلیٰ سطح زندگی ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنے خالق کے آئیڈیل کے روپ میں ڈھل جائے گا، اور خالق کے پلان کے تحت اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو جائیگا۔

گویا کہ حیاتِ آخرت ایک مربوط اور باہم متحد تخلیقی منصوبے کا آخری یا انتہائی مرحلہ ہے اور اس لحاظ سے اہم ترین حیثیت کا حامل۔ تو آئیے تحقیق کا آغاز کرتے ہیں۔

## حیاتِ آخرت کی تعریف

آئیے قارئین، سائنسی تحقیق کا دورانیہ مقابلتاً طویل ہونے کی بناء پر اسے بعد کے ابواب تک مؤخر کرتے ہوئے، اولاً، دوسرے بیان کردہ نظریے کے اتباع میں، قرآن کے حوالے سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

### حیاتِ آخرت :

قرآن میں آخرت کے ساتھ حیات کا لفظ شاذ ہی استعمال ہوا ہے کیونکہ صرف لفظ [الآخرة] ہی کے معنوں میں مکمل اصطلاح [حیاتِ آخرت] موجود ہے۔ ثبوت کے لیے نیچے [لین کی لغت] سے حوالہ دیکھیے۔

### حیات:

حیات کے بارے میں تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ زندگی کا عربی مترادف ہے۔ اس کا مادہ حی ہے۔ نستعلیق اردو زبان میں، یعنی اردوئے معلّیٰ میں بھی زندگی کو حیات ہی کہا جاتا ہے۔ حیاتِ مستعار، حیاتِ نوا اور حیاتِ آفرینی اردو زبان کے ہی ادبی استعارے ہیں اور نثر و شاعری میں کثرت سے مستعمل۔

### آخرت:

اس لفظ کا مادہ اَخَر ہے جس کے بنیادی معانی کچھ اس طرح ہیں:

واپس پلٹنا، پسپائی، پیچھے ہٹنا، ریٹائر ہونا، پیچھے رک جانا، مؤخر کر دینا، التوا میں ڈال دینا، کسی چیز کا فائل یا آخری جزو، ایک اور، دوسری یا ثانوی چیز۔

چند مشتقات درج ذیل ہیں:

(۱) آخر (Aakharu): ایک اور، یا دوسرا

(۲) آخران (Aakharaan): دوسرے دو

(۳) آخرین (Aakharain - acc.)



- (۴) آخرین (Akhiriin - acc.)
- (۵) آخرون (Akhrūun - nom.n.plu.): دوسرے
- (۶) اُخْرٰی (Ukhraa - n.f.): ایک اور
- (۷) اُخْرٰی (Ukharu - n.plu.f.)
- (۸) اُخْرٰی (Aakhiru - n.): آخری؛ فائزل؛ وہ جسے بعد میں آنا ہے؛ بعد ازاں
- (۹) اُخْرٰة (Aakhiratun): آخری؛ بعد میں آئیوالا؛ حیاتِ آخرت؛ اگلی یا آئندہ زندگی

آخری تحریر کردہ مشتق، یعنی نمبر ۹) ہی ہمارا مطلوب و مقصود ہے کیونکہ یہی ہمارے زیر تحقیق موضوع یعنی [حیاتِ آخرت] سے متعلق ہے۔ یہاں واضح ہو کہ لفظ آخرت، جیسا کہ ماقبل میں اشارہ دیا گیا، اپنے تئیں خود ہی ”حیاتِ آخرت“ کی تعریف میں آتا ہے۔ یعنی ”آئندہ مرحلہ زندگی“۔ یعنی اگر ہم حیات اور آخرت کو موصوف اور صفت کے مرکب کے طور پر نہ بھی لکھیں، بلکہ صرف ”آخرت“ ہی کی اصطلاح تنہا استعمال کریں تب بھی ہمارے عنوان کی مکمل ترجمانی ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہمارا عنوان صرف ”تحقیقِ آخرت“ ہوتا، تب بھی مکمل اور خود مکتفی تھا۔ اس لیے کہ خود قرآن میں حیاتِ آخرت کے لیے صرف ”الآخرة“ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ قرآن میں یہ اصطلاح اس کے پورے طول میں کوئی ۱۲۷ بار دہرائی گئی ہے جس سے اس کی انتہائی اہمیت ظاہر ہے۔ الآخرة کے بالعکس، تقابلی ضدین کے اصول کے تحت، اس لفظ کے ساتھ اکثر مقامات پر، کوئی ۶۱ مرتبہ، قرآنی اصطلاح ”حیاتِ الدنیا“ پیش کی گئی ہے، تاکہ ”الآخرة“ کے مفہوم کو درست طور پر جاننے کے لیے کسی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

## تحقیقِ آخرت، از روئے قرآن

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر  
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

قارئین، آپ سوچیں گے کہ قرآن تو دیگر صحائف کی مانند آخرت کا بھرپور پرچار فرماتا ہے، اور جزا و سزا کا قرآنی فلسفہ بیش تر تصویرِ آخرت پر ہی مبنی ہے، اس لیے یہاں تحقیق کے گھوڑے دوڑانا کیا معنی رکھتا ہے؟  
تاہم بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ قرآن کو بھی مخصوص تراجم وضع کرنے کے حربے کے ذریعے آخرت کے انکار کے لیے تختہ مشق بنایا گیا اور استحصالی انداز میں استعمال کر لیا گیا ہے۔ لہذا قرآن سے آخرت کی تحقیق کرتے ہوئے اگر اس میدان میں موجود مخالفانہ مواد کو زیرِ بحث نہ لایا جائے تو ہمارا موضوع نامکمل رہ جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نیز جانبداری کا الزام بھی صادق آسکتا ہے۔

جہاں تک آخرت کی زندگی کی نوعیت سے متعلق مختلف نظریات کا معاملہ ہے، یعنی اُس زندگی کی شکل و صورت اور ماہیت کا سوال ہے، تو یہ ہمارے مقالے کا موضوع نہیں ہے۔ اس معاملے میں عموماً صرف اندازے لگائے جاتے ہیں اور قیاسات سے کام لیا جاتا ہے جن میں غالب عنصر دیومالائی کہانیوں سے اپنے ماخذات لیتا ہے۔ اس ناچیز کے مطالعے کے مطابق نچلی سطح شعور پر زندگی گزارنے والی کوئی بھی مخلوق خود سے بلند تر سطح کے بارے میں ادراک حاصل کرنے کے نااہل ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک چوتھی جماعت کا طالب علم پانچویں جماعت کے کورس سے اور اس کے فہم سے لاعلم رہتا ہے۔ یا ایک اسکول کا طالب علم، یونیورسٹی کی سطح کے علم و فہم سے نابلد رہتا ہے۔ یا بالکل ایسے جیسے سابقہ حیوانی مرحلہ حیات اپنی کم تر شعوری اقدار کے باعث اپنے بعد آنے والے بلند تر مرحلہ انسانی کی زندگی کی ماہیت اور سرگرمیوں کے بارے میں کچھ جاننے سے قاصر ہے۔ آخرت بھی انسان کی موجودہ سطح شعور سے بلند تر سطح ہے۔ لہذا انسان اُس بلند تر سطح کی شعوری اقدار سے لاعلم رہنے پر مجبور ہے۔ البتہ اس زندگی کی نوعیت کی کچھ جھلکیاں تشبیہات کے وسیلے سے تجربی انداز میں اور علامتی اسلوب میں صحائف میں بیان کر دی گئی ہیں۔

اولاً اس موضوع پر آخرت کے وجود کے مخالف دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان دلائل کا تجزیہ، سندات کے ساتھ ان کا مؤثر ابطال، اور بعد ازاں آخرت کے حق میں ان قرآنی نصوص کی تفصیل اور مستند ترجمہ جن سے انکار کی کوئی سبیل نہیں بن سکتی۔ ماسوائے اس کے کہ قرآن اور اس سے ما قبل آنے والے تمام صحیفوں کو الہامی ہدایت ماننے سے ہی انکار کر دیا جائے۔ قرآن کے ماننے والوں میں، بالکل اسی طرح جیسے دوسرے آسمانی صحیفوں پر یقین رکھنے والوں میں، اب تک بلا استثناء حیاتِ آخرت یا حیاتِ بعد از جسمانی موت کا تصور ایک یقینی کیفیت کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے۔ اب تک حیاتِ آخرت کی جو بھی مخالفت

سامنے آئی تھی وہ غیر مذہبی عناصر کی جانب سے تھی جو الہامی صحائف پر یقین و ایمان سے عاری تھے۔ اسی لیے مقام حیرت ہے کہ حالیہ برسوں میں القرآن کے تراجم کے ذریعے حیاتِ آخرت کا انکار کر نیوالا ایک پہلا گروہ پاکستان کے شہر لاہور میں نمودار ہوا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ قرآن کسی حیات بعد الموت یا آخرت کی زندگی کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ آخرت سے اس کی مراد اسی دنیا میں اسی زندگی کا کوئی آئیوالا بہتر اور اعلیٰ دور ہے۔ ایک ایسا دور جہاں قرآنی نظام حیات کی مکمل پیروی نافذ کر دی جائے گی۔

اس جماعت کے دعووں کے مطابق اسی دنیا میں مستبد قوتوں کو شکست دے کر قرآنی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے اور تمام انسانی حقوق میسر کر دیے جاتے ہیں اور امن اور شانتی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی مرحلہ الساعۃ، آخرت، قیامت، وغیرہ ہے۔ یعنی یہ گروہ آخرت کے تناظر میں صرف خوشگواریاں ہی تصور میں لاتا ہے، اگرچہ اسی دنیا کی مادی زندگی کے حوالے سے۔

الحیات الدنیا کی قرآنی اصطلاح کا ترجمہ یہ گروہ ”کم تریا پست سطح کی زندگی“ قرار دیتا ہے، یعنی الحیات الدنیا کی ترکیب کو قطعاً غیر مستند اور بلا اختیار انداز میں توڑ موڑ کر الحیات الادنیٰ کے مترادف ٹھہرا دیتا ہے تاکہ اس تبدیلی سے اس کے وضع کردہ آخرت کے خصوصی معنی میں، تقابلی ضدین کے اصول کی زد سے، کچھ وزن پیدا ہو جائے۔ یعنی بہتر اور اعلیٰ کے تقابلی میں کم تریا پست دکھایا جاسکے۔ یعنی ایک خیالی تقابل اس لیے گھڑنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ما قبل وضع کیے گئے ندرت خیال کے حق میں راہ ہموار کی جائے یا اسکی کمزور بنیادوں کو سہارا فراہم کیا جائے۔

اس گروہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ محمد ﷺ کسی حقیقت، شخص اور وجود کا نام نہیں۔ اس اسم سے موسوم کوئی مخصوص شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ ایک مجہول صفاتی سانچے کا یا ایک تصوراتی کردار کا نام بلکہ لقب ہے جسے بعض ذہین اور طباع لوگوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے گھڑ لیا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی وحی نہیں۔ یہ کتاب کسی ذہین و فطین شخص کی مرتب کردہ ہے اور یہ عہدِ وسطیٰ کی سماجی اور سیاسی کشمکش میں حقوقِ انسانی کے حصول یا پرچار کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس گروہ کا اپنا ویب سائٹ موجود ہے جہاں سے درج بالا حقائق کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

تمام آثار و شواہد اشارہ دیتے ہیں کہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران خارجی محاذ پر دین اللہ کے انہدام کے لیے جو نیا سنگین بحران پیدا کیا جا رہا ہے، اور جس کا ایجنڈا ان ہی مذکورہ نکات پر مشتمل ہے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، اس کے ضمن میں دین دشمن [گلوبل الوینائی] کے کارپردازوں کو مسلم کمیونٹی کے اندر سے جو شریک کار میسر آ گئے ہیں ان میں لاہور کا یہ گروہ بھی شامل ہے۔ ان کے زیر ترویج ایجنڈے کے مطابق اسلام کسی آسمانی اور ربانی القاء کا نتیجہ نہیں، یا کوئی آسمانی دین نہیں ہے، بلکہ خطہ عرب کی مخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورتِ حال اور تناظر میں ایک ذہین اور صاحبِ عزم شخص ”محمد“، جو دراصل نام نہیں بلکہ ”تعریف کے لائق“ صفات رکھتا تھا، کے عزائم اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی تبدیلیوں کا نام ہے۔

قارئین، آخرت سے انکار ایک آسان مہم ہرگز نہیں ہے۔ جس طرح مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، بعینہ ایک آخرت کا انکار انسان کو خود کار انداز میں مزید تکفیر کی طرف بھی کھینچ لیتا ہے۔ لفظ تکفیر سے کسی غلط فہمی کا شکار مت ہو جائیں۔ یہ صرف انکار کے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ فتوے بازی ہرگز اس عاجز کا شعار نہیں، کیونکہ اس ناچیز کے خیال میں اپنے ایمان کا قطعی فیصلہ ہر انسان خود ہی کیا کرتا ہے۔ تو اس تکفیر آخرت میں انسان کے لیے یہ بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کیا جائے، پھر نبوت و رسالت کا بھی انکار کیا جائے اور موت کے لیے بھی کوئی نیا نظریہ گھڑا جائے۔ پس اپنے نظریہ کو تقویت دینے کے لیے یہ چھوٹا سا گروہ بھی اللہ کے وجود سے انکار کرتا اور اپنے تراجم میں اللہ کی ذات کو اسلامی یا قرآنی حکومت کے مترادف تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے، یہ گروہ ”موت“ کا بھی ہر مقام پر استعاراتی ترجمہ کرتا ہے جس کی رُو سے موت کو ہر مقام پر ”اسی دنیا میں قوموں کے زوال“ کے معنوں میں لیتا ہے۔ اسی مفہوم کے اتباع میں، حیاتِ آخرت یا بعثت، قرآن کے ہر مقام پر اور ہر سیاق و سباق میں، قوموں کے از سر نو بیدار ہو کر ترقی کر جانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس کا اعلانیہ موقف ہے کہ جسمانی موت کا قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا، لہذا سزا و جزا، مکافاتِ عمل، جنت و جہنم کی تعبیر اسی دنیا میں اسی جسمانی زندگی میں سامنے آتی ہے۔

یہ گروہ اپنے نظریہ کے حق میں آیت ۲۸/۲ پیش کرتے ہوئے کچھ اس طرز پر استدلال کرتا ہے:-

کیف تکفرونَ باللہ و کنتم امواتاً فاحیاکم، ثم یمیتکم، ثم یحییکم، ثم الیہ ترجعون:

تم اللہ کا کیسے انکار کر سکتے ہو، یہ دیکھتے ہوئے کہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندگی دی۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندگی کی طرف لائے گا [بعثت کے دن] پھر تم اسی کی طرف لوٹو گے۔ [عمومی ترجمہ]۔

”یہ آیت واضح طور پر کہتی ہے: (۱) ہم مردہ تھے (۲) اس نے ہمیں زندگی دی (۳) وہ ہمیں دوبارہ مار دے گا (۴) پھر وہ ہمیں دوبارہ زندہ کر دے گا (۵) پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ دوسرے اور تیسرے مرحلے کے علاوہ باقی نہ تو کسی شمار یاتی گواہی اور نہ ہی مشاہدے سے ثابت کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ماضی کے علم سے۔

کچھ لوگوں کے لیے تو دوسرا اور تیسرا مرحلہ بھی متنازعہ ہے۔ اگر ہم نے اندھا ایمان رکھنا ہے تو اس تمام مشکل بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ہمیں جزوی طور پر کوئی اندھا عقیدہ رکھنا ہے تو پھر کلی طور پر کیوں نہ رکھیں۔ ہم متفق ہیں کہ ہم کسی ایسے [انسان] کو نہیں جانتے جو مرنے کے بعد واپس آ گیا ہو اور ہمیں حیات بعد الحیات کے وجود سے متعلق کوئی

ثبوت دے سکے۔ اور ہمیں ہر چیز سے زیادہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قرآن ایسی چیزوں کے متعلق بات نہیں کرتا

جو ثابت نہ کی جاسکیں یا ہمارے شعور اور فہم سے بالا ہوں۔“

قارئین، ملاحظہ فرمایا آپ نے درج بالا طرز استدلال!

اسی مادہ پرستانہ ایجنڈے کے تحت یہ گروہ حیاتِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اب دیکھیے کہ زیر بحث آیت کا ان کا اپنا وضع کردہ مخصوص ترجمہ کس نوعیت کا ہے:

آیت ۲/۲۸: کیونکہ تم قوانینِ قدرت کا انکار کر سکتے ہو جب کہ تم محکوم تھے تو تم کو آزادی دی، مزید یہ کہ تم محکوم بھی ہوتے

ہو اور آزاد بھی رہو گے اور اسی کے قوانین کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آئیے اب اس ترجمے کا تجزیہ کر لیتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی ذاتِ خالق سے انکار کے لیے [قوانینِ قدرت] کی اختراع استعمال کی گئی۔

۲۔ [مزید یہ کہ تم محکوم بھی ہوتے ہو اور آزاد بھی رہو گے]؟؟؟

کیا یہ [تم یہ پیٹنٹ تم کسیکیم] کا درست ترجمہ ہے؟ اگر ہے تو بتایا جائے کہ گرامر کے کس اصول کے تحت فاعل کو غائب کر دیا گیا ہے؟ اور فقرے کی ساخت کو ”کرنے“ کی بجائے ”ہونے“ میں کیوں تبدیل کر دیا گیا؟ کیا واقعی فاعل، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو درمیان سے نکالنے کے لیے فاعل کا صیغہ غائب نہیں کیا گیا؟

یہاں تو کہا یہ جارہا ہے کہ ”اس کے بعد وہ [اللہ]، یا اس کا مقرر کردہ طبعی قانون، تمہیں موت دے دیتا ہے، یاد دے گا (فعل مضارع)، اور اس کے بعد پھر وہ تمہیں زندگی دے دیتا ہے، یاد دے دیگا“۔ صاف ظاہر ہے کہ اس گروہ کے وضع کردہ موت و زندگی کے تراجم [یعنی محکومی اور آزادی] آیت کے اس حصے پر لاگو نہیں ہو سکتے تھے، اور لاگو کرنے سے ان کا ذاتی ترجمہ بالکل مہمل ہو جاتا، فلہذا آیت کے اس حصے کے متن کی ترکیب ہی بدل ڈالی گئی اور خود ساختہ ترجمہ کر دیا گیا۔ وہ اہم سوال جس کا جواب نہیں دیا گیا یہ ہے کہ

۳۔ کیا اللہ تعالیٰ بار بار اقوامِ عالم کو محکومی اور آزادی دیتا رہتا ہے؟

۴۔ یا صرف دو، دو بار ضرور اس طرح کا عمل کرتا ہے؟

کوئی ثبوت، یا تاریخ سے کوئی مثال؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔

۵۔ کیونکہ کتنی ہی قومیں ایسی گزری ہیں جو ایک بار زوال کے بعد ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے معدوم ہو چکی ہیں۔ یا ہمیشہ کے لیے قعرِ

مذلت کی نذر ہو چکی ہیں۔ لہذا یہاں استعاراتی مفہوم کی بجائے موت کو موت اور زندگی کو زندگی ہی ماننا پڑے گا اور دوسری

مرتبہ کی زندگی کو حیاتِ آخرت ہی ماننا پڑیگا تبھی جملے میں کوئی شعور کا عنصر پیدا ہوگا۔

یہاں ایک اور فرمان الہی بھی نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا جو قطعی فیصلہ کن نوعیت کا حامل ہے:

آیات: ۵۳/۲۷-۳۰: ان الذين لا يؤمنون بالآخرة لیسْمون الملائكة تسمية الأنثى. و ما لهم به من

علم. ان يتبعون الا الظن و ان الظن لا يغنى من الحق شيئا. فاعرض عن من تولي عن ذكرنا و لم يرد الا الحياة

الدنيا.

ترجمہ: وہ لوگ جو حیاتِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ضرور ملائکہ کو مؤنث صنف کے نام سے موسوم کریں گے۔ دراصل وہ بے علم ہیں۔ وہ صرف قیاس کی پیروی کرتے ہیں، جب کہ قیاس حقیقت کے تناظر میں بے سود ہوتا ہے۔ پس اعراض برتوان سے جو ہماری نصیحتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں اور صرف اسی دنیاوی زندگی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ ان کا مبلغ علم بس اتنا سا ہی ہے۔ قارئین، یہ ہے ایک قطعی حسب حال اور خود مکتفی ارشادِ ربانی، جس سے واضح ہوا کہ:

- آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے بے علم ہیں۔

- وہ قیاس پر چلتے ہیں۔

- وہ اللہ تعالیٰ کی نصیحت/کلام سے منہ موڑتے ہیں۔

- اسی دنیاوی زندگی کو مقصود سمجھتے ہیں۔

- ان کا مبلغ علم کچھ بھی نہیں۔

معزز قارئین، کیا واقعی، بقول اس گروہ، یہ تمام حتمی الہی فیصلے صرف ان لوگوں کے خلاف ہیں جو مستقبل قریب میں، اسی دنیا اور اسی زندگی میں، وقوع پذیر ہونے والی کسی تبدیلی کے بارے میں پر یقین نہیں ہیں؟

کیا سب لوگ جن سے یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے، واقعی اتنی طویل زندگی کی گارنٹی رکھتے ہیں کہ کوئی آنے والی تبدیلی دیکھ سکیں؟

جو انسان ساٹھ سے اسی پچاسی سال کی عمر میں مرجاتا ہے، اسے کسی سینکڑوں سال بعد اسی دنیا میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں خوش

گمانی میں کیسے رکھا جاسکتا ہے؟

سب جانتے ہیں کہ قوموں کے حالات میں تبدیلیاں ایک طویل المدت عمل ہوتا ہے جو صدیوں اور ہزاروں کے بعد رو بہ عمل آتا

ہے، وہ بھی اُس صورت میں اگر حالات کسی وجہ سے موافق ہو جائیں۔ جبکہ یہاں تو اس دورانیے میں گزر جانے والے ہر انسان کو انفرادی

طور پر آخرت پر یقین کا مکلف قرار دیا جا رہا ہے۔ کیسے؟

کیا لازمی طور پر یہ کوئی ایسی آخرت نہیں ہے جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا ہے؟

اسی دنیا میں اسی زندگی میں آنیوالی کوئی تبدیلی تو سب نہیں، صرف اُس موقع پر زندہ پائے جانے والے انسان ہی دیکھ سکیں گے یا

نہیں؟

یا پھر واضح طور پر یہ زندگی کے اگلے مرحلے میں بلا استثناء تمام انسانوں کے لیے یکساں منتقلی کا بیان ہے؟ امید ہے کہ اس بحث کے نتیجے میں قارئین خود ہی آسانی سے فیصلے تک پہنچ سکتے ہیں۔

معزز قارئین، قرآن کے متن کی دست برد کے ذریعے حیاتِ آخرت کے انکار کی اب تک اس احقر کے ناقص علم کے مطابق یہی ایک کوشش منظرِ عام پر آئی ہے۔ تو آئیے اس مخالف نظریے کی چھان پھٹک کرنے کے بعد اب قرآنی نصوص کے ذریعے حیاتِ آخرت کی موافقت میں ثبوت دے دیے جائیں۔

آخرت کے لفظ سے متعلق اتنی زیادہ تعداد میں آیات موجود ہیں کہ مقالہ نہایت طویل ہو جائیگا خوف ہے۔ اس لیے آئیے، پہلے مرحلہ میں صرف وہ مقامات دیکھ لیتے ہیں جہاں آخرت کو بمقابلہ حیاتِ الدنیا لے کر اس کا اثبات کیا گیا ہے اور تقابلِ ضدین کا ناقابلِ تردید اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔

آیت ۸۶/۲: أولئك الذين اشتروا الحياة الدنيا بالآخرة، فلا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينعصرون.

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیاوی زندگی خرید لی ہے۔ پس ان پر آنے والا عذاب کم نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائیگی۔

اگر ہم یہاں آخرت سے انکار کرنے والوں کی موقف کے مطابق یہ کہیں کہ:

”وہ جنہوں نے بعد میں [نہ جانے کس وقت آنے والی] اسی دنیا کی زندگی کے بدلے میں کمتر زندگی خرید لی ہے۔۔۔ تو کیا یہ قرینِ عقل ہوگا؟ یقیناً نہیں۔

اور قارئین، ”نہ ہی عذاب میں تخفیف کی جائیگی اور نہ ہی مدد کی جائے گی“ کا فرمان تب ہی قابلِ عمل ہوگا جب انسان مرکزِ مٹی میں نہیں مل جائیگا، بلکہ حیاتِ ابدی پا کر زندہ رہیگا؟ اگر مرکزِ مٹی میں ہی مل گیا، فنا ہو گیا، تو کیسا عذاب اور کیسی مدد؟

آیت ۲۰۰/۲: فمن الناس من يقول ربنا آتنا في الدنيا، وما له في الآخرة من خلاق.

ترجمہ: پس لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمارے رب ہمیں اسی دنیا ہی میں نواز دے، لیکن ایسے شخص کے لیے آخرت میں حصہ نہیں ہوتا۔

کیا ہم یہاں کہہ سکتے ہیں کہ آخرت میں حصہ کا مطلب کسی آنے والے زمانے میں اسی دنیا میں حصہ مراد ہے؟

کیا کسی شخص کی آنے والے کسی زمانے تک زندہ رہنے کی کوئی گارنٹی ہے؟

کیا کسی طرح بھی یہ راست ترجمہ حیاتِ آخرت کے معنی سے پرے ہٹا کر اسی دنیا کے کسی آنے والے دور پر منطبق کیا جاسکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔

آیت ۱۱/۱۶-۱۵: مَنْ كَانَ يَرِيدَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا، نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ لَمْ يَلْمُوْا سِوَاۤىَ النَّارِ، وَحَبَطُوْا مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبِاطِلٍ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

ترجمہ: جو دنیاوی زندگی اور اس کی زمینیں ہی چاہتے ہیں، ہم اس ضمن میں ان کی کاوشوں کی پوری ادائیگی کر دیتے ہیں، اور انہیں محروم نہیں رکھا جاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں۔ جو کچھ اس میں انہوں نے بنایا تھا، ضائع ہو گیا اور جو کچھ عمل کیے وہ بے کار رہے۔

قارئین، کیا یہ اسی دنیا کی کسی بعد کے دور کی زندگی کا ذکر ہو سکتا ہے؟

یا جن لوگوں کو یہ کہا جا رہا ہے، ان کی طویل زندگیوں کی کوئی ضمانت ہے؟

کیا وہ سب لامحالہ اس وقت تک جسمانی زندگی برقرار رکھیں گے جب تک آگ وغیرہ کی سزا ان پر نہیں آجاتی؟

جب اس زندگی میں کاوشوں کی پوری ادائیگی ہو گئی اور محروم نہیں رکھا گیا، تو وہ جن اعمال کے ضائع اور بیکار ہونے کا ذکر ہے وہ کس زندگی کا ہے؟

کیا یہ حضرات اس پیچیدگی کا کوئی شافی جواب دے سکیں گے؟

اگر زندگی صرف یہی جسمانی زندگی ہے تو یہاں الہامی متن میں ایک بڑا تضاد پایا جا رہا ہے جسے حل کرنا ناممکنات میں سے ہوگا؟

ظاہر ہے کہ یہاں بھی سیدھا سیدھا حیات بعد الممات کا ہی ذکر ہے۔

آیت ۱۴۵/۳: وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا، نُوْتُوْهُ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُوْتُوْهُ مِنْهَا.

ترجمہ: جو اس دنیا کے ثواب کی خواہش کرتا ہے، ہم اسے اس میں سے دیدیتے ہیں، اور جو آخرت کے ثواب کی خواہش کرتا ہے، ہم اسے اس میں سے دیدیتے ہیں۔

یہاں آخرت کیا ہے؟ کوئی یہیں آنے والا دور، یا آخرت کی زندگی؟

کسی سینکڑوں سال بعد آنے والے دور کا ثواب کسی کو اس مختصر زندگی میں کیسے مل جائیگا؟

اگر یہ اسی زندگی کا کوئی آنے والا دور ہوتا، تو ہم لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ایمان داری کی زندگی بسر کرتے اور بغیر کسی ”آخرت“ کے ثواب

سے فیضیاب ہوتے، مر جاتے دیکھتے ہیں اور درج بالا آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس ارشادِ خداوندی سے تو حیاتِ آخرت کی موجودگی

کے سوا کوئی اور معنی نہیں نکالا جاسکتا جہاں بیان کردہ ثواب سے متمتع ہو جاسکے۔

آیت ۷۷/۴: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ، وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ، وَلَا تَطْلُمُوْنَ قَهِيْلًا.

ترجمہ: انہیں بتا دے کہ اس دنیا کا مال و اسباب قلیل ہے جبکہ آخرت ان کیلئے جو پرہیزگاری کرتے ہیں بہتر ہے، اور ان کیساتھ کھجور کی گٹھلی

کے دھاگے جتنا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

قارئین، درج بالا دونوں آیات میں دو مرکباتِ اضافی استعمال کیے گئے ہیں، ”متاع الدنيا“ اور ”ثواب الدنيا“۔



یہاں اگر مذکورہ حیاتِ آخرت کے مخالف گروہ کا واحد استدلال جو الحیات الدنیا کے معنی کی شکل میں ہے، منطبق کیا جائے، تو پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ یہاں دونوں مقامات پر دنیا مرکبِ اضافی کا جزء ہے اور واضح طور پر دنیا صفت نہیں بلکہ مقام کو بیان کرتی ہے۔ معنی متاع الدنیا، دنیا کی متاع اور ثواب الدنیا، اسی دنیا کا ثواب ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ مقابلے میں پھر آخرت ہے۔

آیت ۶۷/۲: تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ، وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ.

ترجمہ: تم دنیا کی فراوانی چاہتے ہو جبکہ اللہ آخرت کو پسند فرماتا ہے۔ اور اللہ غالب اور دانا ہے۔ یہاں [دنیا کی پیشکشیں] بمقابلہ [آخرت کی چاہتیں] کیا اسی دنیا اور اسی زندگی کے دورانیے کے دو علیحدہ اور یکے بعد دیگرے آنے والے دور ہو سکتے ہیں؟ اس مختصر زندگی میں کون ہے جو کسی آنے والے دور دراز دور میں خود کو زندہ پانے اور متمتع ہونے کی عبث امید رکھے گا؟

ہاں، البتہ حیاتِ آخرت کی شکل میں دائمی زندگی کا یقین ہو تو اس کی بہتری کے حصول کے لیے اس زندگی میں تمام تر حسین اعمال سرانجام دیے جاسکتے ہیں۔

غور فرمائیے تو کسی طرح بھی دنیا کے دور از کار ترجمے، یعنی ”گھٹیا اور کم تر“ کو یہاں منطبق نہیں کیا جاسکے گا۔ نہ ہی آخرت کے غیر عقلی ترجمے یعنی ”اسی دنیاوی زندگی کے کسی آئیو الے دور“ کی یہاں کوئی گنجائش نظر آئیگی۔

آیت ۳۸/۹: أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ، فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ.

ترجمہ: تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی ہی کے حق میں رضامند ہوئے، تاہم دنیاوی زندگی کا مال و متاعِ آخرت کے موازنے میں قلیل ہے۔

کیا یہاں موجودہ کم تر سطحِ زندگی کو آئندہ آنے والے کسی موجودہ زندگی ہی کے بہتر دور سے تقابل کا موضوع بنایا جا رہا ہے یا کسی دیگر بلند تر سطحِ حیات کی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے جو موجودہ حیات کے بعد ہی ممکن ہے؟ یا اگر مختصر دنیاوی زندگی کے بعد فنا ہی ہو جانا ہے، تو ”کسی اگلے دنیاوی دور“ میں کثرت کے وعدوں سے کسے بہلایا جاسکتا ہے؟ یہاں بھی الآخرة کے حقیقی معانی سے انحراف ممکن نہیں ہے۔

آیت ۱۶/۸: بَلْ تَوَثُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَقْبَلُ.

ترجمہ: بلکہ تم تو دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، جبکہ آخرت کی زندگی بہتر اور زیادہ بقا رکھنے والی ہے۔

قارئین، اگر آخرت اسی دنیا کی کوئی آنے والی زندگی ہے، تو کیسے اس میں زیادہ ”بقا“ ہو سکتی ہے؟

زیادہ بقا تو جسمانی زندگی میں نہیں ہوتی بلکہ حیات بعد الحیات ہی میں ہو سکتی ہے جہاں پہنچ کر انسان، مادی پیکر سے نجات پا کر ایک شعوری توانائی کی لطیف اور جادوئی شکل اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ اس کی اصل حیات مادے سے ماوراء ہے۔

قارئین کرام، اس موضوع سے متعلق آیات اتنی زیادہ ہیں کہ اگلے دس بیس صفحات بھی ان کے بیان کے لیے کم رہیں گے۔ تاہم یہنا چیز امید کرتا ہے کہ درج بالا مواد سے الہامی موقف اسناد کے ساتھ، عین الیقین سے دیکھ لیا گیا ہے۔ ان تمام آیات میں آخرت سے مراد دنیا ہی کا کوئی متوقع دور افتادہ جسمانی زندگی کا دور لیے جانے کے امکانات عقل سلیم کی بنیاد پر بھی ناپید ہیں جبکہ لغوی معانی کا تو ہم تجزیہ کر ہی چکے ہیں۔ یہاں دراصل حیات بعد الممات ہی کا ذکر ہے۔ چند دیگر آیات ملاحظہ فرمائیں:

آیت ۳۰/۴۰: اللہ الذی خلقکم، ثم رزقکم، ثم یمیتکم، ثم یحییکم... هل من شرکائکم من یفعل من

ذلکم من شیئی . سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون .

ترجمہ: اللہ ہی وہ ہستی ہے جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا ہے، پھر تمہیں سامان پرورش عطا فرمایا ہے، پھر بتدریج وہ تمہیں موت سے ہمکنار کرتا ہے اور بعد ازاں پھر زندگی عطا فرماتا ہے۔ کیا جنہیں تم اللہ کا شریک ٹہراتے ہو ان میں سے کوئی ایسا ہے جو مذکورہ کام تمہارے لیے کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ وہ عظیم اور بہت بلند ہے ان باتوں سے جو وہ اس کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔

قارئین، یہاں الآخرة کی اصطلاح استعمال کیے بغیر موت اور پھر، ایک اور زندگی، عطا کرنے کا نہایت واضح اور لفظی مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ کیا یہاں بھی قرآنی تراجم کی دست برد کی طرف گستاخ ہاتھ اٹھانے والے اپنا خود ساختہ ترجمہ منطبق کر سکتے ہیں اور اس موت، اور بعد ازاں آنے والی زندگی کو، آج کی کمتر اور گھٹیا زندگی، اور کل کی آنے والی کوئی بہتر دنیاوی زندگی کے معانی میں تعبیر کر سکتے ہیں؟

افسوس کہ ایسا ہرگز ممکن معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں دیگر امور کا بھی لفظی معانی میں ہی، سلیس انداز میں، ذکر فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ تخلیق کا اور پھر سامان پرورش عطا فرمانے کا۔ پس یہاں بھی ہم کوشش کے باوجود حیات بعد الممات کے علاوہ کچھ اور باور نہیں کر سکتے۔

اور قارئین، اسی آیت مبارکہ کے تحت، لاہور کے اس گروہ کی ان کوششوں کا مؤثر ابطال بھی ہو جاتا ہے جو یہ لوگ اللہ کی مافوق الفطرت ذات کو اپنے جاری قرآنی تراجم میں ایک ٹھوس مادی صورت و ہیئت کی حامل اسلامی یا قرآنی حکومت کی شکل میں تعبیر و تعریف کے حربے کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں غیر مبہم اور سادے لفظی معانی کے انداز میں اللہ کی ذات کو خالق اور پروردگار کے اوصاف سے متصف فرمایا گیا ہے، جسے ایک اسلامی یا قرآنی حکومت سے تعبیر ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک سچی اسلامی یا قرآنی حکومت سامان پرورش مہیا کرنے کا فریضہ تو ضرور تسلیم کرتی اور ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے لیکن زندگی کا خالق ہونے، سامان پرورش کی پیدائش کا نظام قائم کرنے، طبعی موت دینے، پھر موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرنے کی صفات سے بہر حال عاری ہوتی ہے۔ یہ اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کے تشکیل کردہ قوانین کے میڈیم سے حاصل ہے۔

قارئین، کیونکہ حیات بعد الممات کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے وجود کے اثبات سے ایک اٹوٹ رشتے سے جڑا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات بھی ہماری بحث کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور آیت مبارکہ سے ایک فوق الفطرت خالق کے وجود کو ثابت کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آیت مبارکہ ۱۹/۲۹: أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُدْخِلُ اللَّهُ الْخَلْقَ، ثُمَّ يَعِيدُهُ.

ترجمہ: کیا وہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کس کمال سے تخلیق کے عمل کی ابتدا فرماتا ہے، اور اس کے بعد اس پیدائش کے عمل میں بار بار وقوع پذیر ہونے والا نسلی تسلسل قائم فرمادیتا ہے۔

یہاں اللہ کو قرآنی یا اسلامی حکومت سے تعبیر کر کے دیکھا جائے تو سراسر عقل و شعور کی توہین کا ارتکاب ہوتا ہے۔ یہ مانا کہ اکثر مقامات پر اللہ تعالیٰ کی ذات کو قانون قدرت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، اور یہ امر سراسر غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ یاد رکھا جائے کہ ہر قانون قدرت کے پیچھے وہی لافانی ذات موجود ہے جو انسان کی مانند شعور رکھتی، سوچتی، پلان کرتی اور پھر عمل درآمد کرتی ہے۔ حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیے آیت مبارکہ ۵۴/۳: وَمَكْرُؤٌ وَّمَكْرَاللّٰهِ، وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ ”اور انہوں نے پلاننگ کی، اور اللہ نے بھی پلان کیا، البتہ اللہ بہتر پلان کرنے والی ہستی ہے۔“

قانون یا قاعدہ، خواہ وہ تخلیق سے متعلق ہو، ایک شعوری سوچ [conscious thinking] کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ کسی حادثے کے نتیجے میں قاعدے اور قانون تشکیل نہیں پاتے، اور نہ ہی عظیم اور مربوط تنظیمی کارگاہیں وجود میں آتی ہیں۔ حادثے کے نتیجے میں صرف تباہی اور ابتری پیدا ہوتی ہے، نظم و ضبط اور قاعدے قانون نہیں۔ لہذا اگر کوئی انسان، خواہ کسی بھی قومیت سے متعلق ہو، یا کسی بھی بلند شعوری سطح کا حامل سمجھا جاتا ہو، اس محیر العقول درجے پر منظم و مربوط کائنات کو حادثے کا نتیجہ قرار دیتا ہے، تو اس کی ذہنی حالت باسانی مشکوک قرار دی جاسکتی ہے۔ یا پھر یہاں، اس قسم کے کیسز میں، الہامی راہنمائی سے نفرت و انکار کی ایک انتقامی سائیکولوجی کارفرما ہوتی ہے۔

## آخرت کی تطبیق انفرادی ذات کی بجائے نسل انسانی کے مجموعی سلسلے پر

قارئین، ایک سوال عموماً یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا آخرت کا تعلق آئندہ آنے والی نسل انسانی کی کسی ترقی یافتہ شاخ سے ہے یا یہ مسئلہ ہر انسان سے انفرادی طور پر متعلق ہے۔ بعض مفکرین اس موقف کے حامی ہیں کہ حیات آخرت انفرادی انداز میں ہر انسان کے لیے تجویز نہیں کی گئی۔ اور یہ کہ ہم سب یہاں تفہیم کی غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ انعام تو نسل انسانی کی آئندہ آنے والی ان پڑھیوں کے لیے مقرر فرمایا گیا ہے جو ارتقائی عمل سے گزر کر بالآخر اس درجہ کمال تک پہنچ جائیں گی جہاں وہ کامل اتباع قرآنی کا مقصود حاصل کر

لیں گی۔ ہمیشگی کا عنصر، اس موقف کے حامیوں کے لیے، اُس انعام کے ضمن میں ہے جو اُس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہر آئندہ نسل کے نصیب میں لکھ دیا جائیگا۔ وہ انعام ہے: امن، سکون اور فراوانی کے دور کا قیام اور دوام۔ نہ کہ انسانی زندگی کا دوام۔ انفرادی طور پر تو انسان اسی طرز پر مر کر فنا کے گھاٹ اترتا رہیگا۔  
یہ نظریہ بھی دو حقائق کی بنیاد پر باطل قرار دیا جاسکتا ہے۔

اولاً: آخرت کا تعلق اگر صرف بہتری اور انعامات سے ہی ہوتا تو یہ موقف مان لیا جاسکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آخرت تو جزا اور سزا دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔ اُس زندگی میں جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ خوشگواریاں بھی ہیں اور عذاب بھی۔ مزید ارتقاء بھی ہے اور جہیم کی کیفیت بھی، جس میں زندگی دردناک محرومیوں اور پچھتاؤں کا ایک ایسا سکوت مرگ ہوگی جو روح کو پیہم جھلساتا رہے اور انسان اُس ابدی مرحلہ زندگی میں بھی ایک ایسی فنا خیز موت کی تمنا کرے جو میسر ہی نہ ہو۔ ملاحظہ فرمائیں الہامی ہدایت کے خزانے سے چار عدد حسب حال امور کا بیان جو درج بالا نکات کو شرح صدر کے ساتھ واضح کر دیتا ہے:

[۱] ۹/۶۴: وَمَنْ يُّؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا...

اور جو بھی اللہ کے وجود پر یقین رکھتا ہے اور معاشرے میں تعمیری/اصلاحی کام سرانجام دیتا ہے، اس کی غلط کاریاں ڈھانپ دی جائیں گی اور اللہ اس کو ایسے باغات میں داخل فرما دے گا جن کیساتھ دریا بہتے ہوں گے، وہاں ایسے لوگ ہمیشگی کی زندگی گزاریں گے۔  
[ یہ جزا اور خوشگوار یوں کا بیان ہے ]

[۲] ۱۰/۶۴: وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا.. وَبئس المصير...  
مگر وہ جو اللہ کے وجود سے منکر رہے اور ہماری آیات/نشانیوں کو جھٹلاتے رہے، یہی وہ آگ کے حقدار ہیں۔ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

[ یہ جہنم اور عذاب کا بیان ہے ]

[۳] ۴۰/۷۸: إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا..  
ہم نے تم سب کو مستقبل قریب میں آنے والے عذاب کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا جب انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھے گا، اور اُس وقت انکار کرنے والا کہیگا، اے کاش میں صرف مٹی ہوتا۔

[ یہ اُس دائمی زندگی میں پچھتاؤں اور محرومیوں کا بیان ہے ]

[۴] ۱۷/۱۴: يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ...

وہ اس کے گھونٹ بھرے گا لیکن اسے حلق سے اتار نہیں پائے گا۔ جبکہ موت اس پر ہر جانب سے طاری رہے گی مگر وہ نہیں مرنے



کے سوا اور کیا ہے؟ ہم روٹین میں مرتے ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔  
 آیت ۲۴/۴۵: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ. وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ. إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ..

اور یہ لوگ کہتے ہیں اسی دنیاوی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ صرف وقت کا گزران ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ دراصل اس معاملے میں وہ علم سے عاری ہیں۔ یہ صرف قیاس ہی کر پاتے ہیں۔

اور اس کے بعد تو قارئین، قرآن کی رُو سے اس بارے میں کوئی شک و شبہ کا امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ:

موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے  
 خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے  
 موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات  
 عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات  
 یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے  
 کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے  
 چمک سورج میں کیا باقی رہے گی  
 اگر بیزار ہو اپنی کرن سے  
 موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی  
 ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی  
 ،،،،،،،،

مزید دیکھیے آخرت کے ضمن میں متعلقہ آیات:

البقرۃ: ۴، ۸، ۶۳، ۸۶، ۹۴، ۱۰۳، ۱۱۴، ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۷۷، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۱۷، ۲۲۰، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۶۴  
 آل عمران: ۲۲، ۴۵، ۵۶، ۸۵، ۱۴۵، ۱۵۲، ۱۷۶۔ النساء: ۳۸، ۵۹، ۷۷، ۷۸، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۶۲۔  
 المائدہ: ۵، ۳۳، ۴۱، ۶۹۔ الانعام: ۳۲، ۹۲، ۱۱۳، ۱۵۰۔ الاعراف: ۴۵، ۱۵۶، ۱۶۹۔ الانفال: ۶۷۔

التوبة: ١٨، ١٩، ٢٩، ٣٨، ١١٢، ٢٥، ٦٩، ٤٢ - التوبة: ٩٩ - يونس: ٦٢ - هود: ١٦، ١٩، ٢٢، ١٠٣ -  
يوسف: ٣٤، ٥٤، ١٠١، ١٠٩ - الرعد: ٢٦، ٣٢ - ابراهيم: ٣، ٢٤ - النحل: ٢٢، ٣٠، ٣١، ٣٠، ١٠٤، ١٠٩، ١٢٢ -  
الاسراء: ٤، ١٠، ١٩، ٢١، ٢٥، ٤٢، ١٠٢ - طه: ١٢٤ - الحج: ١١، ١٥ - المؤمنون: ٤٣، ٤٢ - النور: ٢، ١٣، ١٩ - النمل:  
٣، ٢، ٥، ٦٦ - القصص: ٤٠، ٤٤، ٨٣ - العنكبوت: ٢٤، ٦٢ - الروم: ٤، ١٦ - لقمان: ٢ - احزاب: ٢١، ٢٩،  
٥٤ - انبياء: ١، ٨، ٢١ - الزمر: ٩، ٢٦، ٢٥ - غافر: ٣٩، ٢٣ - فصلت: ٨، ١٦، ٣١ - الشورى: ٢٠ - زخري: ٣٥ -  
المجادلة: ٢٢ - الحشر: ٣ - الممتحنة: ٦، ١٣ - الطلاق: ٢ - القلم: ٣٣ - المدثر: ٥٣ - القيامة: ٢١ - الاعلى: ٤ - الليل: ١٣ -  
الضحى: ٢ -

## تحقیق آخرت از روئے جدید سائنس

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آئیے قارئین، اب صحائف کی قدیم دنیا سے باہر قدم رکھیں اور اک جہان تازہ کے افکار و احساسات کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی تحقیق کی جولانگاہ جدید علوم کی جانب منتقل کر دیں۔ آئیے عقلیت پسندی [Rationalism] کی بنیاد پر حیات و ممت کے دائرے کو کائناتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ عہد جدید کے مادہ پرستوں کی اس شکایت کا مداوا کیا جاسکے کہ الہامی ہدایت کی پیروی کرنے والے تو سائنسی حقائق کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

یہاں یہ واضح کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جدید علم بھی کائنات کو ایک مجموعی وحدت کی شکل میں ہی دیکھتا ہے اور اس کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنے کے لیے یہ کائنات کی تخلیق کو علم کے تین شعبوں یا تین سائنسز میں اس طرح تقسیم کرتا ہے:

[۱] طبیعی سائنس جو مادے کے قوانین کو بیان کرتی ہے۔

[۲] حیوانی یا حیاتیاتی سائنس جو حیوانی نظام کے قوانین کی تشریح کرتی ہے؛ اور

[۳] انسانی یا نفسیاتی علوم جو انسانی ذہن کے قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حیات اور موت کا تصور دو باہم متضاد و متناقض نظریات میں بٹا ہوا ہے۔ یعنی عمل ارتقاء اور عمل تخلیق۔ یا،،،،، مادی جسم اور غیر مادی شعوری ذات۔ ہمارا زیر نظر موضوع، حیات بعد الممات، ان دونوں میں سے صرف ایک نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔ تخلیق کے نظریے کے ساتھ۔ یا غیر مادی شعوری ذات کے ساتھ۔ اگر ہم جدید علوم پر بحث و تحقیق کے ذریعے حیات انسانی کو تخلیق کا نتیجہ ثابت کر دیتے ہیں، تو خالق کے وجود کا خود کار انداز میں اثبات ہو جاتا ہے، کیونکہ تخلیق کا عمل تخلیق کار، یعنی خالق کی ذات کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مادے کی خود مختار اور لازمی ماخذ تخلیق کی حیثیت کا نظریہ باطل ہو کر، انسان کی غیر مادی شعوری ذات کا نظریہ بھی وثاقت حاصل کر لیتا ہے۔ شعوری ذات کی اکائی کیونکہ غیر مادی حیات کی ایک منفرد وحدت ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی، لہذا حیات بعد از جسمانی موت بھی بالآخر اپنا وجود و جواز ثابت کر دیتی ہے۔

خالق کے وجود کا انکار حیات آخرت کے انکار کا ماخذ یا مولد ہے۔ خالق کے وجود کا انکار روحانیت کے انکار سے بھی

جڑا ہے اور جہاں روحانیت کا انکار ہوتا ہے وہاں زندگی کو مادیت کے ہی پیمانے سے پرکھا اور سوچا جاتا ہے۔ یہی وہ نقطہ نظر ہے جس کے



تحت انسانی جسم کی موت کو انسانی حیات کا خاتمہ یا فنا کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

کیونکہ خالق کا انکار اس پوری کائنات کو ایک حادثے کی پیداوار کے سائنسی نظریے کی طرف لے جاتا ہے، اس لیے حیاتِ انسانی کے تناظر میں کائنات کو ایک علیحدہ اور خود مختار وجود کی حیثیت دے دی جاتی ہے جس میں فطرت کی بے رحم قوتوں اور مظاہر کو انسان کی خلاف ایک ایسا دشمن قرار دے دیا جاتا ہے جس سے وہ مسلسل برسرا پر پیکار ہے اور اپنے تحفظ و بقا کے لیے اس کے اسرار جاننے اور اسے تسخیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تو معزز قارئین، سائنس کی رُو سے حیاتِ انسانی کی بقا کے تسلسل کو آئندہ، یعنی حیات بعد الممات کے مرحلے کے حوالے سے ثابت کرنے کے لیے ہمیں چند حقائق کی تحقیق کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہمیں گمراہ کیا گیا ہے اور تصویر کا صرف ایک رخ دیکھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ وہ حقائق کچھ اس طرح ہیں:-

- [۱] حیات یا زندگی دراصل کیا ہے؟
- [۲] اس کا اصل ہدف، مقصد یا نصب العین کیا ہے؟
- [۳] زندگی کا ماخذ کیا، یا کون ہے؟
- [۴] زندگی انسانی مرحلے تک کیسے پہنچی اور اسے صرف مادی روپ دینا کیسے گمراہ کن ہے؟
- [۵] ایک خالق کے وجود کا کیا ثبوت و جواز ہے؟
- [۶] موت کا سر نہاں کیا ہے؟
- [۷] یہ کائنات حیاتِ انسانی کے تناظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟
- [۸] یہ کائنات حادثے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے یا ایک سوچی سمجھی منصوبہ بند تخلیق ہے؟
- [۹] مغرب سے آئی مختلف مادیت پر مبنی تھیوریاں جو حیات کی ابتدا پر روشنی ڈالتی ہیں کس طرح غلط، بے بنیاد اور تباہ کن ہیں؟

غالباً ان نکات کی تحقیق کے بعد، جس کے ضمن ہم فزکس، بائیولوجی اور نفسیات کے علاوہ علمِ فلکیات سے بھی الجھیں گے، ہمیں ایک ایسا سیر حاصل مطالعہ حاصل ہو جائیگا جس کے بعد یہ تعین کرنا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا کہ حیاتِ انسانی اپنی بائیولوجیکل موت کے بعد بھی ایک خالص غیر مادی روپ میں جاری رہتی ہے۔ اور اسی کو حیات بعد الممات کہا جاتا ہے۔ نیز یہ تمام حقائق ایک قطعی اور طاقتور ترین ماورائی وجود کی پرزور نشاندہی اور تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔

## حیات کی تخلیق و ماہیت پر ایک سیر حاصل تجزیہ

نہ کچھ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہماری تحقیق ابتدائی نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ زندگی کیا ہے۔ مادی جسم یا غیر مادی شعوری ذات۔ اور اس کے لیے ہمیں علم و عرفان کی ان گھاٹیوں سے گزرنا ہے جہاں سے انسان ہی نہیں بلکہ تخلیق کے مجرد عمل کی ابتدا ہوتی ہے۔ جہاں حریم غیب کے بلند ایوانوں میں، اسرار کے دھند لکوں میں لپٹے دبیز پردے سرسراتے ہیں، اور دفعتاً سکوت کی اذلی حکمرانی اور تاریک خلاؤں کی لامحدود وسعتوں میں، پہلی مرتبہ ایک پُر اسرار، ملکوتی، ذی وقار و عظمت، پُر ہیبت و جلال، حیات آفریں صدا گونجتی ہے، جو بزبانِ حال حکم دیتی ہے کہ ”روشنی پیدا کی جائے“ [let there be light]، تاکہ ”تخلیق کا عمل شروع ہو“ [کن]۔

دائمی ظلمتوں میں مستور، خفتہ قوتیں برسرِ عمل آتی ہیں اور، سائنس کی دریافتوں کے مطابق، اولین تخلیق، کائناتی روشنیوں کی لہروں کا منبع، کائنات کا پہلا ذرہ، فوٹون [photon particle] عالم وجود میں آجاتا ہے، جس کا ساکن حجم [rest mass]، فزکس کی روشنی میں، زیرو ہے، جس کی بنا پر اس کی مزید تقسیم ممکن نہیں۔ اسے تقسیم کرنے کی ہر کوشش پر وہ اپنی حرکی قوت کو توڑ کر معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ ذرہ اپنی رفتار کو جو کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، مزید بڑھانے پر قادر نہیں۔ ایسا ہو تو اس کی موجودہ رفتار بھی ختم ہو جائے گی اور ذرہ معدوم ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں کائنات کی تخلیق کے عمل نے اپنی حرکت پذیری کے لیے اپنی پہلی ابتدا ہی سے ایک حد رفتار متعین کر لی۔ فزکس کے ماہرین کے مطابق فوٹون کا حجم اس کی حرکی توانائی [kinetic energy] کے سبب سے ہے۔ فوٹون حرکی طاقت کا مالک ہے۔ اس کی رفتار کم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی ایسی کوشش کے نتیجے میں یہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اور نتیجتاً ایک الیکٹرون اور ایک پوزیٹرون کا جوڑا نمودار ہوتا ہے۔ پوزیٹرون دراصل ایک پازیٹو الیکٹرون ہے۔ یہ عمل ایک جوڑے کی پیداوار [pair production] کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کا روائی کو ”توانائی کی مادیت سازی“ [materialization of energy] کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کی تخلیق کے عمل کا وہ اولین مرحلہ تھا جس نے ایک عظیم تخلیقی خواہش اور تقاضے [urge] کے تحت اپنا طویل سفر شروع کیا۔ اس خواہش اور تقاضے نے تخلیقی عمل کو ”بک سٹارٹ“ کرنے کے لیے روحانی کشش کا ایک عظیم برقی چارج پیدا کیا جو ایک قوت محرکہ کی مانند رو بہ عمل ہوا۔

زندگی کیا ہے؟ یہ سوال آج تک اسرار کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اور ہنوز حل طلب ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ انسان خود اپنی حیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ حیات کے بارے میں جاننے کا مطلب حیات کے مقصد کو جاننا ہے اور جب تک انسان اُس مقصد کو نہیں جان لیتا، وہ خود کو نہیں جان سکتا۔ لہذا اس سے قبل کہ ہم اس سوال کا جواب تلاش کریں کہ حیات دراصل کیا ہے، یہ

لازم آتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو جانے اور اُس مقام کو جان لے جو اس کی منزل مقصود ہے۔ اگر آدمی خود کو اپنے مقصد کے تناظر میں شناخت کر لے، تو یہ نہ صرف حیات کے اسرار کو پاسکتا ہے بلکہ پوری کائنات کے رازوں سے بھی پردہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ کائنات ایک علیحدہ وجود [entity] کی حیثیت سے موجود نہیں ہے، اور اسی طرح آدمی بھی اس کائنات میں ایک بیرونی مداخلت کار [intruder] کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کائنات دراصل انسان کی تشکیل کی طویل تاریخ ہے۔

جب ہم اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور ان قوانین فطرت کا تجزیہ کرتے ہیں جو اس کے طول و عرض میں خود مختار طریقے سے پھیلے ہوئے ہیں، تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ قوانین جو ہمارے اپنے ذہنوں کی پیداوار یا تشکیل ہیں، مکمل طور پر ان قوانین سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی تخلیق کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہے۔ کیوں کہ طویل تخلیقی کارگزاری کے نتیجے میں جو بھی ٹھوس عنصر آدمی کے اندر نمودار ہو کر سامنے آیا ہے وہ اس کا ”شعور ذات“ ہے، لہذا ہم قطعی طور پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کائنات میں جاری و ساری تمام عملی کاروائیاں اپنے اندر شعور کی صفت یا خصوصیت رکھتی ہیں۔

پس، کائنات آدمی سے الگ رہ کر زندہ نہیں ہے۔ نہ ہی وہ ایک خود مختار وجود رکھتی ہے۔ یہ تو انسان کا مولد اور اس کا گوارہ ہے جس کی وساطت سے اُس کی روح یا ذات کی تعمیر ہوئی ہے۔ آسمانوں اور زمین پر مظاہر فطرت کے ساتھ انسان کی گہری شناسائی اس موقف کو مضبوط کرتی ہے کہ آدمی کائنات کی تخلیقی کاروائیوں کے قالب سے گزر کر اپنے موجودہ سطح شعور تک پہنچا ہے۔ اسی وجہ سے آدمی کا کائناتی ماضی اس کی روح پر خاطر خواہ گہرائی سے نقش ہو چکا ہے۔ وہ تمام اوصاف جو کائنات کے تخلیقی عمل کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں، انسانی ذات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انسان ابھی تک تکمیل کے مراحل میں ہے، اور اس کی روح بھی، جو ابھی تک نامکمل ہے۔ یہ حقیقت کہ انسان کا طبیعی وجود ایک مخصوص سطح تک پہنچنے کے بعد مزید افزائش کے قابل نہیں رہتا، مگر انسان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں مسلسل ترقی پذیر رہتی ہیں، اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر تخلیقی کاروائیاں کائنات میں اب بھی جاری و ساری ہیں تو ان کا مقصود کچھ اور نہیں بلکہ انسانی ذات یا روح کی تعمیر ہے جو کہ بتدریج کاملیت کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ لہذا انسان نہ صرف اس کائنات کا اہم ترین جزء ہے بلکہ تخلیق کے سارے عمل کے پیچھے چھپا ہوا مقصد بھی وہ خود ہی ہے۔

انسان کی خود کو جاننے کی خواہش اور اس کا اعتراف کہ وہ اب تک خود آگاہی کے مکمل درجے تک نہیں پہنچ سکا، بے شک بہت کچھ انکشاف کرتا ہے۔ اولاً تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں، کہیں دُور اندر، انسان کو ایک مخصوص ہستی کے وجود کے بارے میں یقین دلادیا گیا ہے۔ اگر اسے یہ یقین دہانی نہ ہوتی تو اپنی ذات کو جاننے کا اور اپنی زندگی کے مقصود کی کھوج لگانے کا سوال ہی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ثانیاً، اس کا یہ اعتراف یا احساس کہ وہ ابھی خود کو جان نہیں پایا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان ابھی تک اپنے تکمیلی مراحل میں ہے۔ یہی اس مسئلہ کی اصل و بنیاد ہے۔

انسان کی ذات یا روح اُس وقت تک کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اُس ہستی سے آگاہی حاصل نہ کر لے جس کی موجودگی کا احساس اسے بے چین کیے رکھتا ہے۔ یعنی دراصل حقیقت کو جاننے کا تقاضا خارجی اثرات کا مرہون منت نہیں۔ یہ اس کے باطن ہی سے اٹھتا اور اسے بے چین کیے رکھتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جب تک انسان اپنی ذات کی حقیقت یا اپنی حیات کے مقصد کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل نہ کر لے، کوئی بھی چیز اسے تسلی نہیں بخش سکتی۔ تاہم اس کا یہ جان لینا کہ وہ نامکمل ہے، بذاتِ خود اس بات کی گارنٹی ہے کہ حقیقت کو جان لینا اس کا مقدر ہے اور اسے ایک عظیم مقصد حاصل کرنا ہے۔

اندریں حالات، انسان مادے کی تشکیل نہیں ہو سکتا۔ مادہ تو خود ایک تخلیق ہے۔ یہ اپنا ایک خاص رویہ رکھتا ہے اور قوانین کو قبول کرتا ہے۔ ایک متحرک ذرے سے لے کر سوچنے والے انسان تک، کائنات کی تمام تر عملی کاروائیاں دراصل انسان کی تخلیق کی کاروائیاں ہیں۔ خود کو جاننے کا عظیم انسانی تقاضہ دراصل اس کے باطن کا اپنے خالق کو جاننے کا روحانی تقاضہ ہے۔ یہ ایک موروثی تقاضہ ہے اور اس تقاضے کے پیچھے جو قوت ہے، وہ خالق کی غیر شعوری محبت ہے۔

کائنات میں انسان کی خود آگاہی تخلیق سے ما قبل کے تمام تخلیقی مراحل میں حیات ایک ابتدائی یا کمتر شعوری سطح رکھتی تھی، اس لیے ان مراحل میں حیات اپنے خالق کے وجود کا براہِ راست احساس یا آگاہی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ ہم حیات کے ان مراحل کو زندگی کی نباتاتی حالت کا نام دیتے ہیں جو مادے کی علامتی اشکال و کیفیات میں رہتی ہیں۔ پھر بھی، ان کمتر مراحل میں بھی حیات میں خالق کے لیے ایک موروثی کشش موجود تھی اور اس روحانی محبت کی تسکین کیلئے حیات نے ایک وحدت کی شکل میں رہتے ہوئے بھی اپنی صفات کو اندرونی طور پر ہی، طبعی مرحلے میں، دو کششوں کے مقناطیسی نقاط، اور حیاتیاتی مرحلے میں دو مخالف جنسی اصناف میں ایک مصنوعی تقسیم کے ذریعے بانٹ لیا تھا۔

انسان کے خود آگاہی مرحلہ حیات میں انسان کی روح یا ذات نے جو کائنات کے ماحصل کی شکل میں نمودار ہوئی، اپنے اندر سے خالق کی صفات کو منعکس کرنا شروع کر دیا، اور اس عمل نے اسے خالق کی موجودگی کا براہِ راست ادراک یا احساس عطا کیا۔ انسانی ذات اپنے باطن میں خالق کی موجودگی کا براہِ راست احساس رکھنے کی وجہ سے تخلیق کے نباتاتی درجے سے بلند ہو جانے کی بناء پر، اپنے روحانی تقاضوں کو اپنے طبعی جسم کی مصنوعی تقسیم کے ذریعے بھی وہ تسکین فراہم نہ کر سکی جو طبعی اور حیاتیاتی مراحل میں حیات نے حاصل کر لی تھی۔ انسانی ذات، جو اب خالق کا براہِ راست عکس اپنے اندر پاتی تھی، اپنے لاشعور کی گہرائیوں سے خالق کی تلاش میں مصروف ہے اور اس مقصد کے تحت وہ اپنے تصوراتی پیکر [Ideals] تراشتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسانی ذات اپنی ذہنی یا روحانی سطح پر اپنے باطن میں خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی الجھنوں میں بٹی ہوئی ہے، اور نتیجتاً وہ اپنی روحانی آگاہی کی روشنی میں جو اس کی ذات میں منعکس ہوتی

ہے، اپنے خالق کو تلاش کرتی ہے۔

کیونکہ انسان ابھی تکمیل کے سفر میں ہے اور ابھی خالق کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا، اس لیے وہ غلطی کے ارتکاب کا امکان رکھتا ہے اور اس کی محبت کو اپنی موجودہ شعوری سطح پر کسی کمتر آئیڈیل کی طرف مرکوز کر دیتا ہے۔ مثلاً جب ہم انسانی تاریخ کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ فطرت کے مظاہر کے زیر اثر انسان سورج، ستارے، دریا اور آگ جیسے عناصر کی پرستش کرتا رہا ہے۔ وہ ان عناصر کو مافوق الفطرت حیثیت دیتا رہا ہے اور انہیں خالق اور پروردگار سمجھتا رہا ہے۔ نیز اپنے روحانی تقاضے کی تسکین کے لیے اور ان عناصر کی عنایات اور خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وہ ان کے حضور قربانیاں بھی پیش کرتا رہا ہے۔ اسی کی مانند، بھوک، بیماری، قحط اور جنگوں سے خوفزدہ انسان، بٹوں کی پرستش میں ملوث رہا ہے۔ ہر بُت کو ایک تصوراتی طاقت تفویض کر دی گئی تھی جیسے کہ بیماریوں سے شفا دینے والا، رزق اور دولت دینے والا، قحط اور جنگوں میں تحفظ دینے والا، وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی ابتدا ہی سے ایک ایسی ہستی کے وجود کی راست آگہی رکھتا تھا جو اس کی سوچوں کے مطابق خود آگاہ تھی، جیسے کہ انسان خود۔

اگر انسان کے باطن میں ایک مافوق الفطرت طاقت کے وجود کی راست پہچان نہ ہوتی، جسے وہ اپنی زندگی عطا کرنے اور پرورش کرنے والا نہ سمجھتا، تو وہ کبھی بھی سورج اور ستاروں، دریاؤں اور سانپوں، بتوں اور انسانوں کی پرستش نہ کرتا۔ وہ صرف اسی سادگی سے اپنی زندگی گزارتا جیسے حیوانات گزارتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات وہی ہیں جو حیوانی زندگی کی ضروریات ہیں۔ البتہ کسی حیوان نے کبھی بھی فطرت کے مظاہر کی پرستش کا ارادہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اس نے کسی وجود سے کسی مدد کی درخواست کی۔ اس امر کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تخلیق کے حیوانی مرحلے تک، زندگی میں اپنے خالق کی راست شناخت موجود نہ تھی۔

بتدریج، جوں جوں انسان علم حاصل کرتا گیا، اس کا تصور حیات اور کائنات تبدیل ہوتا گیا۔ لیکن یہ تبدیلیاں اسے حقیقت کو جاننے کے باطنی تقاضے سے محروم نہ کر سکیں۔ وہ اپنی ذات کی نفی نہ کر سکا اور نہ ہی اپنی فطرت سے انکار کر سکا۔ مذکورہ تبدیلیاں دراصل اس کی ذات نے ہی اس پر اس لیے نافذ کیں کہ وہ ایسے برتر آئیڈیلز کا تعین کر سکے جو اسکے اندرونی تقاضے کی تسکین کر سکیں۔ لہذا بہتر آئیڈیلز کے لیے لائی گئی یہ تبدیلیاں خارج سے مسلط نہیں کی گئیں کیونکہ اس بارے میں تعین کرنے اور فیصلہ کرنے والی ہستی خود انسانی ذات تھی۔ وہ آئیڈیلز جو انسان کے اندرونی تقاضے سے پوری مطابقت نہیں رکھتے تھے، اور نہ ہی اُس تقاضے کی تسکین کر پاتے تھے، کالعدم کر کے ناکارہ قرار دے دیے جاتے تھے۔ اگر اپنی ابتدائی سطح پر انسان نے فطرت کے عناصر کو اپنی زندگی کے پروردگار یا تخلیق کار کے طور پر لے لیا، اور اگر اس نے انسانوں اور بتوں کو مافوق الفطرت درجہ دے کر ان کی پرستش کی، تو آج کا انسان بھی اس امر پر مجبور ہے کہ کائنات کے تشخص کا تعین کرے، تاکہ اس کے حقیقت کو جاننے کے باطنی تقاضے کو پورا کیا جاسکے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر ماضی کا غاروں میں رہنے والا انسان مظاہر فطرت پر یقین رکھتا تھا تو عہد جدید کا انسان اُس مادے کے ہمہ نفوذ اور ہمہ گیر وجود پر یقین رکھتا ہے جس

کے بارے میں اسے باور کرایا گیا ہے کہ یہ ہی انسانی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ بالفاظِ دگر، جدید انسان اس بات پر متفق ہے ایک ”جاہل مطلق“ علم والوں پر حکومت کر رہا ہے۔

وہ اپنی حیات کے آزادی، عقلیت، دانائی، محبت، ہمدردی اور حقیقت کی تلاش جیسے اوصاف سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہے۔ وہ متفق ہے کہ زمین پر انسانی حیات ایک حادثہ کی وجہ سے کچھ عناصر کے امتزاج کے ذریعے پیدا ہو گئی ہے۔ ان عناصر کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ہی انسان دوبارہ مادہ میں گم ہو جاتا ہے۔ مادی قوتوں کے نظریے کے حامی مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں۔ کچھ اس نظریے کے حامی ہیں کہ طاقتور مادہ ایک اندھی قوت کے مانند موجود ہے۔ یہ نہ کوئی قانون رکھتا ہے، نہ اصول، اور اسی لیے نہ کوئی مقصد۔ کچھ دوسرے یقین رکھتے ہیں کہ مادہ ہمہ جہت ہے جس کے قوانین حیات کا تعین کرتے ہیں اور ساتھ ہی انسان کی شعوری ذات کا بھی۔ دوسرے الفاظ میں انسانی ذات مادی قوتوں کی ایک ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ ان نظریات کے علاوہ، ایسے مفکر بھی ہیں جو طاقتور جبوتوں پر یقین رکھتے ہیں جو، ان کے نظریے کے مطابق، حیات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ایک نامور مغربی مفکر یہ یقین رکھتا تھا کہ انسان جنسی جذبہ کے تابع ہے۔ اُس کے خیال میں انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں کے پیچھے جنسی جذبہ ہی واحد حقیقت اور محرک ہے۔ ایک اور مفکر نے اپنی تمام فلاسفی خوراک کے حصول کے جذبے کے گرد تعمیر کی۔ کتنی عجیب صورت حال ہے کہ لوگوں نے ان تمام نظریات کو برداشت کیا اور نتیجے میں ناقابل اصلاح نفسیاتی اور جسمانی عوارض برداشت کیے جو انسانی تہذیب کے لیے تباہ کن اثرات کے حامل تھے۔

کیونکہ ان نظریات کے مطابق زندگی ایک مشین سے زیادہ کچھ نہ تھی، جس کی کوئی بھی روحانی اہمیت نہ ہو، لہذا اخلاقیات کو بھی ریاضیات کی مانند ایک ایسی سائنس کے طور پر لے لیا گیا جو کہ روحانی اقدار سے آزاد، انسانی علوم کی ہی ایک اور شاخ ہو۔ اسی سوچ کی مطابقت میں، بجائے بلند تر اقدار کی طرف ترقی کر جانے کے، ان اخلاقیات کو ان مادی ضروریات کی تسکین پر زور دینے کا ذریعہ بنا لیا گیا جو حیات کے حیوانی پہلو سے متعلق تھیں، یعنی جبلت کی تسکین اور حیات کا تحفظ۔ ان مقاصد کی تکمیل کیلئے اگر یہ لوگ افراد اور اقوام سے دھوکا بازی کا استعمال کریں یا انسانیت کا خون کرنے پر اتر آئیں، تو پھر بھی حق پر ٹہرتے ہیں۔ جدید معاشروں نے ان جرائم کے ارتکاب کو جدید تہذیب کا نام دے کر اداروں کی صورت میں ترقی دے دی اور اس طرح انسان کو جبلی لذتوں کے حصول کا کھلا لائسنس دے دیا۔ انہوں نے اپنے متبعین کو بتایا کہ اگر وہ اپنے جبلی جذبوں کی تسکین کرنے میں ناکام ہوئے تو انہیں ذہنی عوارض اور اذیت برداشت کرنی پڑی گی۔

اس فلسفہ کا سب سے زیادہ المناک پہلو جو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ ہے کہ انسان نے اپنی شعوری ذات کے عظیم روحانی تقاضوں کو کھو دیا اور ان کا رخ جبراً جبوتوں کی تسکین کی طرف موڑ دیا جیسے کہ جبلت ہی زندگی کا بڑا محرک ہو۔ جب جبلت کی تسکین ہی مقصدِ حیات ٹھہرا، تو ہم مختلف معاشروں کے مابین مادی اسباب و ذرائع کی تحصیل کے لیے ایک پاگلانہ مسابقت کے سوا اور کیا

توقع کر سکتے ہیں؟ اس مسابقت کی کوئی حدود بھی نہیں ہیں کیونکہ اس کی پشت پر شعوری ذات کا محدود دباؤ موجود رہتا ہے جو کبھی بھی ادنیٰ درجے کی شعوری اقدار سے بہلایا نہیں جاسکتا۔ لہذا جدید دنیا میں موجود تمام نفسیاتی جنونوں و خلل کی جڑ بنیاداً انہی جلتوں کی تسکین کیلئے کی جانے والی پاگلانہ مسابقت ہے جو اس لیے غیر معمولی حدود کو چھو رہی ہے کہ انسانی ذات کے طاقتور تقاضے مادی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف موڑ دیے گئے ہیں۔

انسان کیونکہ ابھی تک میلی مراحل میں خوار و زبوں ہے اس لیے اس میں اپنی ذات کے تقاضوں کو غلط شناخت کرنے کا رجحان موجود ہے، جنہیں وہ مادی ضروریات کی تکمیل کی شکل میں تعبیر کر لیتا ہے۔ تاہم معاشرتی ڈھانچوں کی تاریخ کی رُو سے یہ غلط شناخت دائمی حیثیت اختیار نہیں کر پاتی، اور انسانی فطرت جلد یا بدیر ایک نظام کو مسترد کرنا اور دوسرے کو اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ جلی ضروریات کی تسکین نہیں ہوتا کیونکہ یہ ضروریات تو متعین ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ درحقیقت ان معاشرتی انقلابوں کے پیچھے اسی شعوری ذات کا دباؤ ہوتا ہے جو خود کو اپنی موروثی صفات اور روحانی اقدار کے ساتھ شناخت کرنا چاہتی ہے۔

تخلیق کے تمام مراحل کے دوران خالق زندگی کی راہنمائی کرتا رہا ہے۔ اپنی تخلیق کے معاملے میں فطرت اتنی مہربان اور اتنی فکر مند ہے کہ ایک بچے کی پیدائش سے قبل ہی وہ اس کی جسمانی ضروریات کیلئے دودھ تیار رکھتی ہے۔ لہذا اسی بنیاد پر خالق نے انسان کو اس کے روحانی تقاضوں کی تسکین کیلئے خاص روحانی خوراک بھی فراہم کی ہوگی۔ ہم بصورتِ عمومی بھی فطرت کی کارکردگی میں کوئی خلایا کوئی رخ نہ نہیں پاتے۔ پس اگر فطرت نے انسان میں خود کو جاننے کی طاقتور خواہش ودیعت کر دی ہے، اور اس ذریعے سے اُس کے خالق کو جاننے کی بھی، تو لازم ہے کہ ایک غلطی سے پاک اہتمام اُس روحانی تشنگی کو مٹانے کے لیے بھی کر دیا ہوگا۔ یہ روحانی خوراک خالق نے اپنے پیغمبروں، یعنی انتہائے شعور تک پہنچے ہوئے انسانوں کے ذریعے فراہم کی ہے۔ انسانی تاریخ ان حقائق کی گواہ اور ثبوت ہے۔ جدید عہد کے انسان نے البتہ الہامی ہدایت کی روشنی میں مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے خود انسان ہی کے متعین کردہ آئیڈیلز یا مقاصد کا اتباع شروع کر دیا جو کبھی بھی درست اور کامل نہیں ہوتے۔ انسان جو خود ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے، اپنی ہنوز کم تر شعوری سطح پر انسانیت کے مثالی پیکر یا آئیڈیل کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس لیے آئیڈیل کا درست تعین خالق ہی کر سکتا ہے جو تخلیق کے عظیم تر مقصد کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔

انسان نے کبھی اتنا عذاب نہیں جھیلا ہوگا جیسا وہ ایسے جلسا زوں کے ہاتھوں جھیل رہا ہے جو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ وہ زندگی کا مقصد یا ماخذ متعین کر سکتے ہیں۔ تاہم انسان اپنے موروثی تقاضے کے خلاف نہیں جاسکتا۔ اسے الہامی راہنمائی کی طرف پلٹنا ہی ہے جو کہ انسان کے لیے صحیح آئیڈیل فراہم کرتی ہے تاکہ انسانی ذات کو روحانی تسکین اور خوشیوں کی معراج تک پہنچا دے۔ تمام خود ساختہ نظریات مادے کو ایک خود مختار وجود کا درجہ دیتے ہیں۔ مادہ ایک خود مختار وجود کی حیثیت میں موجود نہیں

ہے۔ وہ زندگی کے بالکل ابتدائی مرحلے کی شکل میں موجود ہے، جیسے کہ دیگر تخلیق شدہ مراحل زندگی، مثلاً نباتاتی اور حیوانی مراحل۔ زندگی بہت سے تخلیقی مراحل سے گذر چکنے کے بعد موجودہ انسانی مرحلہ میں نمودار ہوئی، جہاں وہ خود آگہی یا شعور ذات سے ہمکنار ہوگئی۔ اس کا مطلب سیدھا سیدھا یہی ہے کہ اس مرحلہ پر زندگی نے اپنے باطن میں اپنے خالق کا عکس دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ صرف خود آگہی یا شعور ذات ہی کی وجہ سے ہے کہ انسان خود کو مادی مراحل زندگی سے آزاد کرنے کے قابل ہوا ہے۔ انسانی مرحلہ سے قبل زندگی ایک مادی حالت میں متحرک تھی اور اُس حالت میں اسے خالق کی راست آگہی نہیں تھی۔ اُن مراحل میں زندگی قیاس، اندازے [inference] اور علامتوں [symbols] کے ذریعے پیش قدمی کرتی رہی۔ آسان الفاظ میں، مادی حالت حیات، حیوانی مرحلے تک، یوں سمجھی جا سکتی ہے جیسے کہ مختلف ادوار میں اس کی پال پوس اور پرورش ایک جنین کی شکل میں رحمِ مادر میں کی جا رہی ہو۔ اس قسم کی حالتوں میں زندگی علامتی تفریق [symbolic differentiation] کے ذریعے قائم رہتی اور ترقی کرتی ہے اور کبھی اپنی ماں کے وجود اور خارجی دنیا سے آگاہ نہیں ہو پاتی۔

اسی کے مانند، حیوانی مرحلے کی تکمیل کے بعد، انسان کی اس کے خود آگاہ مرحلے پر نمود، اس کے خالق کی روحانی دنیا میں اُس کی پیدائش کے مماثل تھی جہاں وہ اپنے خالق کی براہ راست پہچان کی تلاش میں منہمک رہا ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ایک نومولود اپنی پیدائش کے فوراً بعد اپنی ماں کی تلاش اور پہچان کرنے کی سعی کرتا ہے۔

ان حقائق کے ادراک کے بعد ہم کیسے یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اتنے طویل سفر اور گونا گوں کیفیات و مراحل سے گذر کر حیات جس ترقی یافتہ مرحلے میں داخل ہوئی ہے، وہ صرف اس لیے کہ فنا کے گھاٹ اُتر جائے۔ کسی عطائی سے مستعار لیا ہوا فلسفہ اس فنا کا جواز پیش نہیں کر سکتا۔ اصل حیات شعور ہے اور شعور ایک غیر مادی حقیقت رکھتا ہے، خواہ وہ شعور مطلق ہو یا انسانی زندگی۔ انسانی زندگی کو مادے سے نجات پا کر خالص شعور کے مرحلے میں داخل ہونا ہے جہاں ارتقاء کیے لامحدود امکانات اُس کے منتظر ہیں۔ یہی وہ آخری مرحلہ ہے جہاں زندگی کی حقیقت اور مقصد بارز ہو کر سامنے آتا ہے۔

جدید تصور حیات جو دہریت [atheism] اور تشکیک [agnosticism] پر مبنی ہے، انسانیت کو ابتری اور مایوسی کی دہلیز پر لے آیا ہے۔ خود ساختہ نظریات اور بہت سی سائنسز نے جو انسان نے دریافت کیں اور ترقی دی ہیں، انسانیت کو مزید تقسیم کر دیا ہے۔ یہ سوچ کہ مادہ یا توانائی نہ ہی تخلیق کردہ ہیں اور نہ ہی تباہ ہوتے ہیں، سائنسدانوں کا پیش کردہ سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ہے۔ یہ نظریہ جو کہ آج عالمی سطح پر تسلیم کردہ ہے، کائنات کے تخلیقی طریق کار سے نابلد ہونے کے باعث گھڑا گیا ہے۔ اگر ہم یہ نظریہ قبول کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدا کی ہستی نہیں جو دائمی حیثیت کی مالک ہے، بلکہ یہ مادہ یا توانائی ہے جو دائمی وجود رکھتی ہے اور حقیقت مطلق ہے۔ یہ بے شک ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے جو نسل انسانی کی روحانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن لوگوں کا



یہ فرض ہے کہ وہ اس تھیوری کو دھوکا بازی اور مبنی بر جہالت ثابت کریں۔

ایک دیگر خطرناک ترین تھیوری جس نے انسانی سوچ کو مقید کر دیا ہے وہ ارتقاء [evolution] کی تھیوری ہے۔ یہاں بھی اگر ہم اسے حقیقت کے طور پر قبول کر لیں تو ہم دراصل خدا کے وجود کی نفی کر رہے ہوں گے۔ جدید انسان کی تیار کردہ یہ تھیوری بھی آج عالمی طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، فزکس کے ماہرین اور ارتقائی دانش ور یہ چاہتے ہیں کہ ہم یقین کر لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں جو لافانی ہے اور کائنات کی خالق، بلکہ یہ مادہ یا توانائی ہے جو کہ حقیقت ہے اور کائنات کو ارتقاء دے رہی ہے۔ اس جائزے کے آخر میں علامہ اقبال کے ”اسلام میں مذہبی فکر کی تعمیر نو“ کے عنوان سے دیے گئے لیکچروں سے ایک اقتباس پیش کرنا غیر متعلق نہ ہوگا۔

”کلاسیکل فزکس نے خود اپنی بنیادوں پر نکتہ چینی کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس نکتہ چینی کے نتیجے میں وہ خاص نوعیت رکھنے والی مادیت پرستی جو اس نے اصلاً ضروری سمجھی تھی، تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس آج تک شک و شبہ سے بالا، ہم آہنگی کے میدان دریافت کر لیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ فلسفیانہ سوچ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے حتمی یا آخری کہا جائے۔ جوں جوں علم بڑھتا جاتا ہے اور سوچ کے تازے در وا ہوتے جاتے ہیں، دوسرے تصورات، ممکنہ طور پر بہتر تصورات، بمقابلہ ان کے جو ان لیکچرز میں سامنے لائے جا رہے ہیں، سامنے آنے ممکن ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ انسانی سوچ کی ترقی کو محتاط نظر سے دیکھتے رہیں اور اس کی طرف ایک بے لاگ، خود مختار تنقیدی رویہ قائم رکھیں۔

انسانیت کو صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی ایک روحانی تشریح و توضیح، فرد کی روحانی آزادی اور کائناتی اہمیت رکھنے والے وہ بنیادی اصول جو انسانی معاشرے کی روحانی بنیاد پر ارتقاء کی طرف راہنمائی کریں۔“

## کائنات اور شعورِ مطلق [خالق]

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات      خودی کیا ہے، بیداریء کائنات  
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے      نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

آئیے اب چند سطور میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ مادے [matter]،،،، نیچرل سلیکشن [natural selection]،،،، اور خود کار ارتقاء [automatic evolution] کے نظریات کیسے باطل ٹھہرتے ہیں۔ اور ایک خالق کا وجود ثابت ہو جانے پر ”حیاتِ آخرت“ کا نظریہ کیسے از خود وثاقت حاصل کر لیتا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل، سائنس کے حوالے سے ایک خالق کے وجود کا انکار کرنے والوں کی خدمت میں چند عظیم اور متفقہ طور پر مستند مانے جانے والے سائنسدانوں کے اقوال:-

آئن سٹائن: سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے، اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا۔  
نیوٹن: وہ خدا لافانی، قادرِ مطلق، ہمہ مقتدر اور علیم وخبیر ہے، یعنی وہ ازل سے ابد تک رہیگا۔  
لوئی پاسچر: میرا علم جتنا ہے، میرا ایمان اتنا ہی زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ سائنسی تعلیم کی کمی انسان کو خدا سے دور لے جاتی ہے جبکہ اس میں وسعت اور گہرائی اس کے قریب تر پہنچا دیتی ہے۔  
لارڈ کیلون: اگر تمہاری سوچ میں قوت ہے تو سائنس تمہیں خدا پر ایمان لانے پر مجبور کر دیگی۔ [عمر بھر کی سائنسی تحقیقات کے بعد اخذ شدہ نتیجہ]

طبعی قوانین کی کائناتی ہمہ گیریت جس کی بنیاد ایک مربوط اور متحد نظام پر رکھی ہوئی ہے، تخلیق کائنات کے پس پردہ ایک مثبت مقصدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں بھی قوانین یا نظام ہوگا، وہاں ان کی پشت پر کوئی مقصد ضرور پایا جائے گا۔ اب آئیے مقصد کی طرف۔ تو مقصد کو ایک باشعور ذات یا باشعور وجود سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی مقصد پایا جائیگا، اُس کے پیچھے ہمیشہ ایک باشعور ذات ہوگی جس نے وہ مقصد سوچا اور متعین کیا ہوگا۔ یہ حقیقت کہ کائنات قوانین پر چلتی ہے اس لیے ایک مقصد بھی رکھتی ہے، اس امر کو واضح کرتی ہے کہ کائنات کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ لازمی ہے کہ یہ ایک شعوری ذات یا شعوری وجود کے وصف کی مالک ہے۔ لہذا یہ مفروضہ یا دھوکا کہ کائنات کی حقیقت مادہ ہے، اب ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر مادے کو کائنات کی حقیقت گردانا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مادہ نہ صرف خود کا شعور رکھتا ہے، بلکہ خود کے مقصد اور نصب العین سے بھی آگاہ ہے۔ تاہم ایسا سوچنا حقیقت کے برعکس ہوگا کیونکہ مادے کی ارتقائی کارگزاری یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مسلسل کمتر

شعوری سطحوں سے برتر شعوری مراحل کی طرف اٹھتا ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ کسی جانب سے پیشگی منصوبہ بندی کیے بغیر، مادہ خود بخود بلند تر شعوری درجے کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ اگر یہ بڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کمتر سطح کے مرحلے پر رہتے ہوئے بلند تر اقدار کا شعور رکھتا ہے۔ جو کہ ممکن نہیں ہے۔ لہذا کسی ایسے وجود کا ہونا ضروری ہے جو کہ نہ صرف شعور ذات رکھتا ہے بلکہ کائنات کی تخلیق کے مجموعی مقصد کا شعور بھی رکھتا ہے۔ اور زندگی کے اس طویل کارواں کی قدم بہ قدم راہنمائی کر رہا ہے۔

صرف استدلال کی غرض سے اگر یہ سوچا جائے کہ، کیونکہ مادہ بھی شعور کی صفت سے متصف ہے اور اس وجہ سے مادہ اور شعور دو متوازی حقیقتیں ہیں، تو پھر بھی ہمیں اس قیاس آرائی کو براہ راست کا عدم قرار دینا ہوگا، اس لیے کہ دو حقیقتیں پہلو بہ پہلو زندہ نہیں رہ سکتیں، کیونکہ طبعی قوانین کی آفاقیت [universality] جو ایک واحد مقصد کی سمت اشارہ کرتی ہے، کسی ثنویت یا اجتماعیت کو تسلیم یا قبول نہیں کر سکتی۔

اُن صاحبان کے موقف کے حق میں، جو مادے کو کائنات کی اصل حقیقت مانتے ہیں، ہمارے پاس ایک اور مفروضہ باقی بچتا ہے۔ وہ یہ کہ مادہ ایک بیج کی صفت رکھتا ہے جو خود کو ایک ارتقائی عمل کے تحت نشوونما دیتا ہے۔ لیکن مادے کو ایک بیج کی حیثیت دینے میں ہمیں اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ کون ہے جو اس بیج کی نشوونما کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک بیج تو دراصل مٹی، ہوا اور پانی کے ذریعے نشوونما پاتا ہے۔ اور اسی کی مانند ایک جنین [foetus] بھی ہے جو آنول نال [umbilical cord] کے ذریعے سامانِ نشوونما پاتا ہے۔ لہذا، جب تک ”مادے“ کا بیج ”شعورِ مطلق“ یا ایک ”ذاتِ کامل“ کے توسط سے نشوونما نہ پارہا ہو، مادہ کبھی بھی خود کو اپنے تئیں ارتقاء دے کر کسی بھی متعین منزل مقصود کی طرف رواں دواں نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ہم اسے کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ یہ تھیوری بھی محلِ نظر ہے کہ زندگی نے اپنے تئیں، خود کار انداز میں، طبعی انتخاب [natural selection] کے طریق کار کے ذریعے تشکیل پائی ہے۔ یہ نظریہ صرف اُس صورت میں با معنی کہلا سکتا تھا اگر طبعی انتخاب ایک شعوری عمل کی حیثیت رکھتا اور یہ انتخاب ایک مخصوص و متعین مقصد کے اتباع میں کیا جاتا۔ کسی مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر طبعی انتخاب فقط ایک اندھا قدم اٹھانے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ اور اس نوع کے اندھے اقدام کا انجام ماسوائے تباہی اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت کہ یہ کائنات کامیابی سے ابتدائی شعوری مراحل سے گذرتے، ترقی کرتے، بلند تر مراحل میں داخل ہو چکی ہے، اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ یہ ایک متعین منزل کی سمت میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات نہ صرف خود میں ایک وجود رکھتی ہے بلکہ ایک تخلیق ہے اور متعین اور یقینی اصولوں اور قوانین کے تحت تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے۔ نیز یہ کہ ان اصولوں اور قوانین کی پشت پر ایک ایسی ہستی موجود ہے جو اپنے مقصد سے بھی آگاہ ہے اور ایک طاقتور، نادر الوجود اور قطعی منفرد حیثیت میں

خود اپنے وجود سے بھی۔ ایسا وجود جب تک خود آگاہ نہ ہو، اور اپنی صفات و ممکنات کا مکمل ادراک نہ رکھتا ہو، تخلیق نہیں کر سکتا۔ ہم ایسے وجود کو شعورِ مطلق یا ذاتِ مطلق کہہ سکتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر، یہ کائنات ایک تخلیق ہے جس میں وہ ذاتِ مطلق اپنے آئیڈیل کی نمود فرما رہا ہے جو اُس کی ذات کے اندرون میں موجود ہے اور اُس سے تقاضہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اُسے سامنے لائے۔ کیونکہ ہر تخلیق کی ایک ابتدا بھی ہوتی ہے اور انتہاء بھی، اس لیے تخلیقی طریق کار، سرسری نظر میں، خود کو ایک ایسے ارتقائی عمل کی شکل میں ظاہر کرتا ہے جس کے ذریعے خالق کا آئیڈیل یا مقصود خود کی نمود کر رہا ہے۔ یہ نمود انسانی حیات کی صورت جس ترقی یافتہ مرحلے تک پہنچ پائی ہے، ہنوز اپنے نقطہ عروج سے دور ہے۔ وہ نقطہ عروج خالق کے آئیڈیل کی صورت بارز ہونے کے لیے ایک مزید مرحلے کا منتظر ہے۔ یہی وہ اگلا مرحلہ ہے جو حیاتِ آخرت کا نام رکھتا ہے۔

یہ کائنات ایک واحد کائی کی صورت میں تخلیق کی گئی ہے۔ اس لیے ہم یہ باور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کا خالق بھی واحد ہی ہے۔ کیونکہ یہ کائنات اپنی تخلیق کے کئی مراحل کے بعد انجام کار انسانی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، اور کیونکہ اس انسانی مرحلے میں اب تک کا عظیم ترین نقطہ عروج، شعورِ ذات کا حصول ہے، اس لیے ہم وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا دور رس مقصد انسان ہی کی تخلیق تھا۔ اس لیے دراصل انسان ہی شعورِ مطلق کا آئیڈیل ہے جسے خالق نے خود اپنے ہی اوصاف کی روشنی میں شکل دے کر اور پرورش کر کے بہت سے مراحل سے گزارتے ہوئے تیار کیا ہے۔ یہاں تک کہ انسانی مرحلے تک پہنچ کر خالق کے اوصاف انسان میں ایک روح کی شکل میں نمودار ہو گئے۔ کیونکہ جو اوصاف انسان میں روح [یا ذات] کی صورت میں نمودار ہوئے، وہ شعورِ مطلق یا ذاتِ مطلق کے اپنے اوصاف ہیں، اس لیے انسانی روح یا ذات نے اپنے اندر سے اپنے خالق کی موجودگی کا احساس و ادراک کر لیا اور اس کی عکاسی کرنی شروع کر دی۔ انسان کے اندر شعورِ مطلق کی اس عکاسی نے اسے خود آگاہی یا شعورِ ذات عطا کر دی۔

لہذا ہم اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ کائنات کے تمام سابقہ تخلیقی مراحل کا مطلوب و مقصود انسان کی تخلیق تھا۔ اور۔ کیونکہ جو کچھ انسان کے تخلیقی مرحلے میں ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ شعورِ ذات ہے، تو اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر تخلیقی مرحلے میں، بنیادی طور پر، یہ شعور ہی تھا جو خالق کیلئے ایک طبعی کشش کی صورت اُبھرتا رہا، اور ہر مرتبہ اس کی سطح اُن شعوری اقدار کے مطابق تھی جو خالق نے ہر مرحلہ کیلئے متعین و مختص کر دی تھی۔ اس پہلو سے نظر ڈالنے پر کائنات اُس ذاتِ مطلق کا ایک ایسا تخلیقی فن پارہ [Art] معلوم ہوتا ہے جو اپنی ترقی کے سفر کے ساتھ ساتھ، خالق کی شعوری اقدار کی عکاسی کرنے میں مصروف کار رہا ہے۔

انسان میں شعور کی عکاسی یہ ظاہر کرتی ہے کہ خالق دراصل کائناتی شعور کا مالک ہے۔ اس امر کا یہ کافی ثبوت ہے کہ ہر تخلیق، خواہ وہ انسانی ہو یا آسمانی، خالق کے اوصاف کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ یہ خالق کی خواہش اور ارادہ ہے جو اسے تخلیق کی طرف اُکساتا ہے۔ اور اگر خالق اپنی تخلیق میں اپنی ذات کے تقاضوں کا اظہار نہ کر سکے، یا اگر تخلیق اپنے خالق کے اوصاف و خصائص کی عکاسی نہ کر سکے، تو تخلیق کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے۔ پس ہر تخلیق، خواہ انسانی ہو یا آسمانی، اپنے خالق کے اوصاف و خصائص لازماً منعکس کرتی ہے۔

اپنے اوصاف، خوبیوں اور خصائص کے اظہار کی خواہش خالق کے اندر ایک تقاضہ پیدا کرتی ہے کہ وہ تخلیق کرے۔ دوسری طرف جوں جوں تخلیق نمود پاتی ہے، وہ خود بخود اپنے ماخذ منبع کی سمت بڑھتی ہے، جو کہ اُس کا خالق ہے اور جس کے اوصاف پہلے ہی سے تخلیق میں منعکس ہوتے ہیں۔ یہ امر خود کار طرز پر تخلیق کے اندر یہ تقاضا پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی جستجو کرے اور اس سے پیار کرے۔ کائنات کے تناظر میں یہ حقیقت اس صورت میں سامنے آتی ہے کہ جوں جوں یہ اپنے تئیں خالق کے اوصاف کی جھلک پاتی ہے، یہ سخت جدوجہد کرتی ہے کہ خالق کو ایک حقیقی پیکر دے کر بارز کر سکے۔ تخلیق اپنے تمام تر وجود کے لیے خالق کی مقروض ہوتی ہے، اس لیے اس کی حقیقی خوشیاں خالق کی جستجو میں سرگرداں رہنے اور اس سے محبت کرنے میں پنہاں ہوتی ہیں۔ جو کچھ بھی تخلیق ہوتا ہے وہ خالق کی اپنی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری طرف تخلیق بھی خالق کی خواہش کے نتیجے میں بن سنور کر وجود میں آتی ہے جس میں خالق کی روح تیرتی ہے اور تخلیق کو زندگی بخشی ہے۔ وہ زندگی جس کا ارتکاز اپنے ماخذ یعنی خالق کی سمت ہوتا ہے۔

قارئین محترم، اگر خالق و مخلوق کے درمیان موجود ناقابل تردید روحانی رشتے اور لازوال محبت کے ان مٹ بندھن کے ضمن میں درج بالا منطقی بحث کسی قدر ناقابل قبول محسوس ہو تو آئیے اس کو سمیٹتے ہوئے، اس کی تائید و تصدیق مزید کے لیے علامہ اقبال کے افکار عالی سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ علامہ صاحب جب مومن کا لقب استعمال کرتے ہوئے ایک انسانِ کامل کے اوصافِ حمیدہ، صفاتِ خالق کے پُر زور تناظر میں بیان فرماتے ہیں، تو عمیق نظر رکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ اقبال کی نگاہ جہاں میں حقیقتِ مطلق کی اُن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی جن کا بیان آپ نے اوپر کی سطور میں نوٹ فرمایا۔ وہ بے شک ”محرم رازِ درونِ مے خانہ“ تھے اور معانی کے اک سمندر کو چند اشعار کے کوزے میں بند کرتے اور ایک خوبصورت اتمامِ حجت کی راہ ہموار کر دیتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان و نئی آن

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

غالب و کار آفرین، کار کشا و کار ساز  
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دل بے نیاز  
جنہیں بخشا ہے تُو نے ذوقِ خدائی  
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ  
خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات  
یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے  
دو نیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا

-----

## توانائی [energy] اور شعورِ مطلق

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو فروغِ دیدہ افلاک ہے تُو

آئیے قارئین، مادے، نیچرل سلیکشن، اور خود کار ارتقاء،،، کے نظریات سے نبرد آزما ہونے کے بعد، اب توانائی کی حقیقت پر بھی فزکس کی روشنی میں ایک سیر حاصل تحقیق کر لیتے ہیں، تاکہ خالق کے وجود اور نتیجتاً حیاتِ آخرت کے اثبات کے سلسلے میں اذہان میں کوئی بھی پھانس چھپی نہ رہ جائے۔ یہ امر یہاں غالباً دہرانے کی ضرورت نہیں کہ حیاتِ آخرت کا نظریہ لازماً ایک شعورِ مطلق کی مالک ہستی کے وجود سے جڑا ہے جو توانائی کی مانند غیر مادی وجود رکھتا ہے اور جو تمام تر سلسلہ تخلیق کا پلانر اور خالق ہے۔

جیسا کہ ماقبل کے عنوانات کے تحت ذکر کیا گیا کہ اب سائنس کی دنیا میں یہ عمومی یقین رائج ہو چکا ہے کہ کائنات کی حقیقت توانائی ہے۔ قبل ازیں یہ خالص مادہ باور کی جاتی رہی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اگرچہ مادہ توانائی کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور اسی کے مانند توانائی مادے میں تبدیل ہو سکتی ہے، اس کے باوجود مادے کوئی شکل ایسی نہیں جس میں توانائی موجود نہیں۔ اسی لیے توانائی کائنات کی حقیقت اور نچوڑ ہے۔ تمام خوبصورتی اور کشش جو اس کائنات میں موجود ہے، دن کی روشنی اور رات کا اندھیرا، تمام رنگ اور ان کے مختلف شیڈ اور مادے کی تمام کیفیات، کائنات کے بالکل ابتدا سے لے کر انسان کے دانش مند مرحلے تک، سب توانائی کے مظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی خود آگاہ حیات، توانائی کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ دانائے راز کے الفاظ میں:-

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو فروغِ دیدہ افلاک ہے تُو

تیرے صیدزبوں افرشتہ و حور کہ شاہین شہ لولاک ہے تُو

ہم بہت سی ایسی اشکال کا علم رکھتے ہیں جن میں توانائی مختلف انداز میں استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فزکس کے قوانین کے مطابق آواز فضاء میں مختلف لہریں پیدا کرتی ہے۔ یہ لہریں اگر ایک مقناطیسی فیتے [magnetic tape] پر محفوظ کر لی جائیں تو یہ دوبارہ آواز کی شکل میں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ حیاتیاتی [biological] مراحل میں توانائی خود کو انتہائی پیچیدہ شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر ہم ایک لکڑی کا ٹکڑا اجلائیں تو لکڑی میں مستور توانائی خود کو کاربن، حرارت اور روشنی کی اشکال میں ظاہر کرے گی۔ حتیٰ کہ اس کی باقیات، راکھ، فضاء میں چھوٹے ذرات کی شکل میں غائب ہو جائیں گے۔ اس طرح لکڑی جو توانائی کی ایک مستور شکل تھی، جلنے کے بعد توانائی کی کئی اشکال میں تبدیل ہو گئی۔

تاہم، ہم توانائی کو کائنات کی حقیقت کے طور پر، اس نہایت سادہ سی بنیاد پر، قبول نہیں کر سکتے کہ یہ کبھی بھی استحکام نہیں

رکھتی۔ کوئی بھی چیز جو اپنے آپ میں مستحکم نہ ہو، نہ ہی خالق ہو سکتی ہے اور نہ ہی کائنات کی اصل و حقیقت۔ اسی بنیادی اصول، بلکہ بنیادی سقم کی روشنی میں کچھ فلاسفوں اور مفکرین نے یہ موقف اختیار کر ڈالا کہ تو انائی کی پشت پر ایک اور قسم کی تو انائی ہے جو، ان کے مطابق، کائنات کی حقیقت ہے۔ اس کو یہ ”مستحکم تو انائی“ کا نام دیتے ہیں۔

بظاہر یہ قیاس متاثر کن معلوم ہوتا ہے کیونکہ حرکت پذیری جو عام تو انائی کی بنیادی خصوصیت ہے، تبدیلی کے عمل سے گذرتی رہتی ہے اور جو چیز بھی تبدیلی کا ہدف ہو، خالق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ”مستحکم تو انائی“ ہی کائنات کی حقیقت ہو سکتی ہے جو اس کائنات کو تعمیر کرتی اور اس کی صورت گری کرتی ہے۔

تاہم جب ہم کائنات کے تخلیقی طریق کار کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ کائنات تو سلسلہ وار تدریجی مراحل میں تخلیق کی گئی ہے۔ اور وہ بنیادی خصائص جو ان مراحل کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہیں وہ کم تر یا بلند تر شعوری اقدار ہیں۔ اس لیے جب تک بلند تر متعین منزلوں کے حصول کے لیے تو انائی کی پشت پر ایک ذہن یا شعور کا فرمانہ ہو، تو انائی کی کوئی بھی شکل، خواہ عمومی ہو یا مستحکم، بغیر کسی پیشگی تفہیم و تعین کے، خود بخود کم تر شعوری مراحل سے بلند تر شعوری مراحل تک منتقل نہیں ہو سکتی۔ یعنی کائنات کے مادی مراحل سے آگے بڑھتے ہوئے انسان کے شعور ذات کے مرحلے تک۔ مزید یہ کہ تو انائی، خواہ عمومی ہو یا مستحکم، کائنات کے حاضر وجود کی وضاحت و تشریح نہیں کر سکتی۔ مادے کی تمام شکلیں، کاسموس کے جیومیٹرک اوصاف، فزیکل قوانین کا ہم آہنگ تسلسل، زندگی میں کشش اور تقاضے، ایسی خصوصیات ہیں جو محض جھٹکوں [jolts] یا حرکت پذیری [motion] سے نمودار نہیں ہو سکتے۔

لہذا ہمارے پاس یہ یقین کر نیکے لیے کافی دانش موجود ہے کہ جب تک تحرک اور رفتار ایک ایسی طاقتور ہستی کے ذریعے راہنمائی اور کنٹرول نہیں کیے جاتے، ایک ایسی ہستی جو ستاروں کے جھلملانے، بادلوں کے گرجنے، دریاؤں اور نہروں کے بہنے، پھولوں کے کھلنے اور زندگی میں وہ تقاضہ پیدا کر سکنے کی قوتوں کی مالک ہو کہ وہ تمام تر شان و شوکت کیساتھ خود کی نمود و اظہار کر سکے، اوپر بیان کی گئی کوئی بھی اقدار وجود میں نہیں آسکتیں۔ مزید برآں، وہ تمام خوبیاں جو ایک نئی شکل میں انسان میں ظاہر ہوتی ہیں جیسے کہ ایمان، محبت، عزت نفس، ارادہ اور شعور ذات، وغیرہ، واضح طور پر اشارہ دیتی ہیں کہ تو انائی، طبیعیات کے ماہرین کے نظریات کے علی الرغم، اس حیرت انگیز کائنات کی حقیقت نہیں ہو سکتی۔

کائنات کی حقیقت صرف کوئی ایسی ہستی یا ایسا وجود ہی ہو سکتا ہے جو خود آگاہ ہو اور ایسے اوصاف کا مالک ہو جس نوعیت کے اوصاف خود انسان کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر، ہم نہ ہی انسان کے اندر موجود ارادے اور عزم کی خصوصیات کی وضاحت و تشریح کر سکتے ہیں اور نہ ہی حیات کے باطن میں عمومی طور پر موجود محبت اور کشش کے عناصر کی وضاحت کر سکتے ہیں جو کائنات



کے تمام تخلیق شدہ مراحل میں آشکار ہے۔

## توانائی دراصل کیا چیز ہے۔

اسی بناء پر ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ توانائی دراصل اُس جذبہ کشش کی قوت ہے جو زندگی یا شعور کی اندرونی صفات میں سے ایک ہے۔ بالفاظ دیگر، توانائی شعور سے آزاد کوئی وجود نہیں رکھتی۔ جہاں کہیں بھی توانائی ہے وہاں شعور بھی موجود ہوتا ہے۔  
توانائی کی تمام اکائیاں زندہ اور شعور رکھنے والی ہیں لیکن اپنے اپنے تخلیقی مرحلے یا سطح کی حدود میں مقید ہیں۔ آفاقی مرحلے میں یہ اکائیاں مادی اجسام کی شکل میں زندہ تھیں۔ حیاتیاتی مراحل میں زندگی کی یہ اکائیاں یا توانائی، نباتات اور حیوانات کے اجسام میں زندہ تھیں۔ اور انسانی مرحلہ زندگی میں یہ اکائیاں انسانی شعور یا انسانی ذات کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ ہم توانائی کو شعورِ مطلق کی شعوری یا تخلیقی قوت کا نام بھی دے سکتے ہیں، جو ہر تخلیقی عمل میں اپنی مرضی و ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے ہر حرکت پذیری یا پیش قدمی دراصل ایک عمل کے قالب میں ڈھالی گئی سوچ، یا شعوری اقدام ہے۔

شعورِ مطلق اپنی ذات اور اوصاف میں یگانہ ہونے کی حیثیت میں اپنے حسن اور سحر کو ایک مثالی پیکر کو صورت میں تصور کرتا اور اسے حقیقت کا روپ دینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جب تک وہ اسے حقیقت کی شکل نہیں دے دیتا، وہ مثالیہ جو خالق کے ذہن میں پنپتا رہتا ہے، وہ اُس کے باطن سے اسے تخلیق کے لیے ابھارتا اور مائل کرتا رہتا ہے۔ اس طرح تخلیق کی پشت پر جو حقیقی تقاضہ ہے وہ دراصل آئیڈیل [ایک قابل ستائش تصوراتی پیکر] کے لیے شدید محبت اور کشش ہے جو ابھرتی ہے تو حرکت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تقاضہ جو ”فطرت“ کے اندر زندہ ہے، جب آئیڈیل کی کشش کے ذریعے توانائی پاتا ہے تو مادے کی علامت میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے توانائی کچھ اور نہیں بلکہ کشش پر مبنی ایک برقی کرنٹ ہے۔ اس کی ہر حرکت اپنے ساتھ خالق کے مثالی پیکر کے اوصاف لے کر پیدا ہوتی ہے۔ تحرك [motion] نہ تو اپنا خود مختار وجود رکھتا ہے اور نہ ہی یہ اپنی نوعیت میں خود کار ہے۔ یہ دراصل شعور کی کاروائی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے اوصاف و خصوصیات کو مشہود کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ثابت ہوگا کہ تمام عملی کاروائیوں کا سرچشمہ درحقیقت شعورِ مطلق ہے۔

ہم تحرك [motion] اور مادے [matter] کو دیکھ سکتے ہیں لیکن توانائی کو نہیں۔ کیونکہ توانائی غیر مادی ہے اور حیات اس کو محسوس نہیں کر سکتیں۔ ہم تحرك اور توانائی کی خصوصیات کو کائنات کے طبیعی اور حیاتیاتی [biological] مراحل میں ان کے طریق کار کا مطالعہ کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے توانائی اور تحرك کے جدید نظریے مبہم اور گمراہ کن ہیں۔ یہ قیاسات اور ابہام پر مبنی ہیں۔ طبیعیات دان توانائی کی تعریف،،،،، ”ایک ایسی چیز جو کام کرتی ہے“،،،،، کہہ کر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قطعی مبہم تعریف ہے جو دراک حقیقت تک نہ پہنچ پانے پر اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ کام صرف اُس کام کو کہا جاسکتا ہے

جو کسی پسندیدہ اور متعین شدہ مقصد کے حصول کے لیے کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر، کسی بھی حرکت کے پس منظر میں کوئی مقصد یا محرک ضرور ہونا چاہیے۔

## کائنات کی تخلیق کے مراحل۔

ہمارے نظریے کی سیر حاصل تعریف کرنے کے لیے ہمیں کائنات کی تخلیق کے مختلف مراحل کو، اور ہر مرحلے میں توانائی کی شکل اور اس کی حرکت پذیری کو متعلقہ مرحلے کی شعوری سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے زیرِ تحقیق لانا ہوگا۔ اگرچہ کہ کائنات ایک واحد اکائی کی صورت میں زندہ ہے پھر بھی جب اس کے بہت سے طریق کار سنجیدگی کے ساتھ زیرِ غور لائے جاتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی مختلف، خود کار، کردگار ہوں کی شکل میں تخلیق کیا گیا ہے وہ زندگی یا شعور ہی ہے۔ یہ خود کار سسٹم یا مراحل ہیں:۔ [۱] فلکیاتی مرحلہ [۲] زمینی مرحلہ [۳] نباتاتی مرحلہ [۴] حیوانی مرحلہ اور [۵] آخر کار انسانی شعور ذات کا مرحلہ،،،،، جو کہ کائنات کا اب تک معلوم سب سے اہم اور بلند ترین شعوری مرحلہ ہے۔ چھٹا اور آئندہ مرحلہ کیونکہ خالص غیر مادی، شعوری مرحلہ ہے اور موجودہ مرحلہ حیات سے بلند تر درجہ کا حامل ہے، اور حیاتِ آخرت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس لیے ہم اپنی موجودہ سطح پر رہتے ہوئے، تخلیقی مراحل کے مکمل سیاق و سباق میں، اس مرحلے کے بارے میں صرف حتی المقدور تحقیق ہی کر سکتے ہیں۔ اُس کی مکمل آگہی اس مرحلہ میں رہتے ہوئے ممکن نہیں۔ آئیے یہاں ہم سب سے قبل انسانی خود آگاہ یا شعور ذات کے مرحلے کو زیرِ بحث لاتے ہیں جو کائنات کا سب سے اہم اور بلند ترین شعوری مرحلہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم ان مادی اشکال یا اجسام پر سرسری نظر ڈالیں گے جو انسان نے دنیا میں ہر جگہ انسانی مرحلے پر اپنے نمودار ہونے کے بعد تعمیر کی ہیں۔ ہم بڑی بڑی عمارتیں دیکھتے ہیں، سڑکوں کے جال، فیکٹریاں، موٹر گاڑیاں، فرنیچر، کپڑے اور ساز و سامان کی ناقص اقسام دیکھتے ہیں۔ یہ تمام اشیاء حرکت کے نتیجے میں بنائی گئی ہیں۔ حرکت کا وسیلہ یعنی آلات [tools] جو انسان نے استعمال کیے بہت سے ہیں اور مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ ان آلات کو ہم تفہیم کی آسانی کے لیے تین گروپوں یا درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم میں طبعی طور پر ماقبل سے وضع شدہ وہ آلات ہیں جو انسانی جسم اپنے ساتھ لاتا ہے، جیسے کہ ٹانگیں، ہاتھ، پیر وغیرہ۔ دوسری قسم میں وہ آلات ہیں جو زندگی کے حیوانی مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے کہ پالتو حیوانات۔ تیسری قسم میں وہ آلات ہیں جو انسانی ذہانت نے مادے کی بے شمار زندہ اشکال سے تخلیق کیے ہیں جیسے کہ پودے، معدنیات اور عناصر بشمول پانی، گیس، بجلی وغیرہ۔ ان آلات کے گروپ کو ہم میکینیکل آلات کہہ سکتے ہیں جیسے کہ ہتھوڑا، درانتی، کرینیں، موٹر گاڑیاں، ٹیل ڈورزر، جزیرے اور مختلف قسم کی مشینیں۔ یہ تمام آلات انسانی ذہانت یا انسان کی شعوری ذات استعمال اور کنٹرول کرتی ہے تاکہ متعین مقاصد حاصل کر سکے۔ ایک چیز جو مشترک طور پر ان تمام آلات میں پائی جاتی ہے اور جس نے ان آلات کو استعمال کو ممکن بنایا ہے وہ حرکت [motion] ہے۔ حرکت خواہ میکینیکل ہو یا طبعی، یہ سست ہو یا سریع، تمام اشکال جو انسان نے زمین پر وضع کی ہیں حرکت ہی کا نتیجہ ہیں۔ تاہم حرکت ان آلات کے بغیر ناممکن ہے۔ اور ان آلات کی حرکت، خواہ وہ ہاتھوں کی حرکت ہو یا مشینوں کی، اُس خاص

مقصد کے بنا کوئی وجود نہیں رکھتی جو انسانی ذہن نے یا انسان کی شعوری ذات نے حاصل کرنے کی خواہش یا تقاضہ کیا ہو۔

مشینوں کی تیاری میں بھی یہ انسانی شعور ہی ہے جو مشینوں کی شکل میں عمل پذیر ہوتا ہے۔ حرکت کے وسیلے یا آلات کی

حیثیت میں مشین اُس انسانی شعور کی سوچ کے بغیر وجود میں ہی نہیں آسکتی تھی جس نے اسے تخلیق کیا ہے۔ اب، جیسا کہ ہمارے سامنے عیاں ہے، بنیادی طور پر حرکت کی خصوصیت وہی ہے، لیکن حرکت کا ذریعہ یعنی آلات، بہت سی شکلیں رکھتے ہیں۔ ان آلات میں سے ہر ایک کی حرکت کے اندر انسانی شعوری ذات کا مقصد کارفرما ہوتا ہے جو اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ آلات انسانی ہاتھ اور پیر کے اضافی اعضاء ہیں جن کے ذریعے انسانی ذہن اور شعور مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے عمل پیرا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پین یا پنسل جیسے آلات، ہاتھ جیسے آلات کی حرکت کا اتباع یا پیروی کرتے ہیں، اور یہ دونوں نوعیت کے آلات انسانی شعور کے ذریعے کنٹرول اور استعمال ہوتے ہیں جو انہیں متعین مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح آلات کی تمام دوسری اشکال بھی دراصل انسانی جسم کے ہاتھوں کے اضافی اعضاء ہیں جن کے ذریعے انسانی شعور اپنا کام کرتا ہے۔ اگر ہم انسانی عقل یا شعوری ذات کو اس سے الگ کر دیں، تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا میں موجود تمام انسانی بنائی اشکال بھی غائب ہو جائیں گی۔ اور ان کے ساتھ ہی وہ آلات بھی جو انسانی ذات نے تخلیق کیے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ یہ دراصل انسانی شعور ہی ہے جو حرکت کو پیدا کرتا ہے اور لہذا ان آلات کو انسانی شعور ہی تو انائی فراہم

کرتا ہے جب اور جہاں تک یہ زندہ اور باشعور ہیں۔ بصورتِ دیگر آلات اور تو انائی کی یہ شکلیں اپنا وجود ہی قائم نہیں رکھ سکتیں۔

تو انائی اور حرکت کے بارے میں ابہام اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سائنس دان اور ماہر طبعیات اشیاء کو جزوی طور پر علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے عادی ہیں، یعنی مجموعی مقصد پر غور کیے بغیر۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کائنات کو ایک سالمہ کی حیثیت سے لیتے ہوئے حرکت کی اصل کو ان آلات کے تناظر میں، جن کے ذریعے یہ کام کرتی ہے، بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

جیسے کہ اوپر وضاحت کی گئی، حرکت یا اس ضمن میں اس کا کوئی بھی آلہ کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ ایک خاص طریق کار کی پیروی نہ کرتا ہو جو اُس عظیم تر مقصد یا شعور نے متعین کیا ہو جو کائنات کو تدریجی مراحل میں تخلیق کر رہا ہے۔ کائنات کے ہر تخلیقی مرحلہ میں آلات حرکت کی ایسی لاتعداد اشکال ہو سکتی ہیں جنہیں مجموعی مقصد نے زندگی دی یا تو انائی بخشی ہو۔ اور اسی طرح حرکت کے بھی ایسے لاتعداد انداز ہو سکتے ہیں جو ہر مرحلہ تخلیق پر حاصل کی گئی شعوری اقدار کی استعداد یا سطح کے مطابق ہوں۔ بالفاظِ دیگر ان آلات کی تمام انواع کے باوجود کائنات میں سرایت کی ہوئی بنیادی تو انائی صرف ایک ہی ہے اور وہ تو انائی میکینیکل نہیں، جیسے کہ فزکس کے ماہرین عموماً دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ایک زندہ اور باشعور تو انائی ہے جو اپنی ذات سے آگاہ بھی ہے اور اپنے مقصد سے بھی۔

مثال کے طور پر آئیے ہم کائنات کے پہلے تنظیمی مرحلے کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں آلہ حرکت ”فوٹون“ کا ذرہ ہے اور اس کی حرکت روشنی کی رفتار ہے۔ فوٹون کو شعورِ مطلق نے اپنے آئیڈیل کے ظہور و نمود کے لیے تخلیق فرمایا۔ فوٹون جب تک شعورِ مطلق یا خالق کے ارادے کی تکمیل کرتا ہے، یہ زندہ ہے۔ مادے کی تمام مختلف النوع اشکال اور ان کے درجات نے، جو کاسمک [cosmic] مرحلے میں تخلیق کیے گئے اور جنہیں فزکس دان تو انائی کی مختلف صورتوں کا نام دیتے ہیں، اس حرکت کا اتباع کیا جس کا تقریر خالق نے کاسمک مرحلے کے متعین مقصد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ لہذا حرکت اور اس کے آلات جیسے کہ ذیلی ایٹمی ذرات، ذرات، ایٹم، وغیرہ جن کے ذریعے حرکت نے خود کو، جزوی طور پر ذرات کے ٹکراؤ کے ذریعے اور جزوی طور پر ذرات کے مابین واقع تعلق اور کیفیات اور باہمی کشش کے ذریعے، جاری رکھا ان کا تعین زندگی کے کاسمک پلان کی مجموعی شعوری اقدار نے کیا تھا۔ جب کاسمک مرحلہ اپنی تکمیل کے نکتے پر پہنچا تو حرکت کے تمام انداز اور اس کے آلات یعنی ذرات، مختلف عناصر کے ایٹم، اور ان کے عظیم کائناتی اجسام کی شکل میں، منظم و مربوط ڈھانچے بن کر، مستقل طور پر اپنی ہیئت پر قائم ہو گئے۔ کاسمک مرحلے کا تمام تر مقصد عناصر کی مختلف اشکال کی تخلیق تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر عنصر کاسمک مرحلے میں خالق کے تخلیقی عمل یا طریق کار سے تشکیل پایا گیا ایک فن پارہ تھا۔ یہ عناصر دراصل کاسمک مرحلے کا نچوڑ یا حاصل ہیں جو حرکت کی ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو ایک عظیم منصوبے نے متعین کی تھیں۔

تخلیق کا بنیادی قانون ہمیں بتاتا ہے کہ ہر مرحلے کی تکمیل پر جو بھی شعوری اقدار یا سسٹم جو پلان کے تحت حاصل کر لیے گئے انہوں نے مستقلاً اپنی جگہ قائم رہنا تھا۔ اگر طبیعیات دان کچھ خاص عناصر کے ایٹمز کے خود کار عمل کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں ایٹم کی غیر ترقی یافتہ یا ناچختہ [crude] شعوری سطح کے مطابق ایک طبعی رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ طبیعیات دان ایٹم کے اندر موجود عظیم ہنرمندی اور فن کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بجائے وہ اس خام خیالی پر خوشی مناتے ہیں کہ یہ ایٹم انسانوں اور ان کے کارناموں کو تباہ کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان کے سامنے تو انائی کا تصور میکینیکل اور crude حرکت ہے جو کسی مقصد یا شعور سے عاری ہے۔ طبیعیات دان ایٹم کی اس خوفناک حرکت کو تو انائی کا نام دیتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا، انسان بھول جاتا ہے کہ ایٹم کا یہ آلہ [tool] تخلیق کرنے میں فطرت نے حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ لیکن یہ انسان ہے جس نے ایٹم کو ایک تباہی کے آلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بھی اگر انسان ان ایٹموں کی خصوصیات کو سدھا کر تعمیری مقاصد میں استعمال کرے، ان کی زندگی تباہ کیے بغیر، تو یہ خوف کا ماخذ زندگی بچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

درحقیقت کائناتی مرحلے میں تو انائی کی تخلیق شدہ مختلف اشکال کی خصوصیات کو ترتیب دے کر، ہم آہنگ کر کے، سکون

پذیر کر کے، بالآخر ان عناصر کے خول کے اندر اتار دیا گیا ہے جو کائنات کی ابتدائی یا بنیادی اینٹوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اسی لیے اگلے خود مختار مرحلے، یعنی سیارہ زمین کے مرحلے کے اندر ہم ان عناصر کو پہلے سے تیار شکل میں پاتے ہیں اور ہمیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ماقبل میں کبھی مختلف شکل رکھتے تھے۔ کاسموس کے پہلے تخلیقی مرحلے کی تکمیل پر دوسرا بلند تر شعوری منصوبہ سیارہ زمین پر بطور ایک علیحدہ خود کار سسٹم شروع ہوا۔ اس بلند تر شعوری منصوبے کے تحت سیارہ زمین نے ماقبل میں تعمیر شدہ عناصر کو کام کے آلات کی طرح استعمال کرتے ہوئے حرکت کا طریق کار مزید متعین کیا۔ عناصر کی حرکت یا طریق کار جو اس طرح متعین ہوا اسے ہم طبعی قوانین کہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ طبعی قوانین الٹے پلٹتے اور تبدیل ہوتے رہے، یہاں تک کہ یہ ایک مکمل واحد نظم کی صورت ہم آہنگ ہو گئے۔ زمین کے اپنے شعوری لیول کے تحت اس کی تمام طبعی تشکیل، اس شعوری سطح کی نمود تھی جو زمین نے مختلف مادوں اور ان کے باہم اختلاط کے ذریعے، یا توانائی کی ان صورتوں کو، جو زمین نے خود متعین کی تھیں، حرکت [motion] کے آلات کے طور پر استعمال کر کے حاصل کی۔ ان میں وادیوں کی بلندیاں اور پستیاں، مسلسل تبدیل ہوتے موسم، پانی کی روانی، میدان، سمندر، دریا وغیرہ شامل ہیں، سب کی بنیاد اس حرکت کے انداز پر رکھی گئی جو ہم آہنگی اور شراکت کار کی پیدا کردہ تھی، جو کہ صرف اور صرف شعور کی صفات ہیں۔ ایک کامل نظم کی صورت میں تکمیل پر یہ قوانین اپنی جگہ اٹل ہو گئے اور اسی لیے یہ حرکت کے اس طریق سے روگردانی نہ کر سکتے تھے جو سیارہ زمین نے ایک زندہ اکائی کی حیثیت میں اپنی مجموعی شعوری اقدار کے تحت متعین کی تھی۔ یہاں بھی کیمیادی مادوں اور ان کے اختلاط کے نتیجے میں لاتعداد اشکال جو سیارہ زمین نے آلات حرکت یا عمل کی شکل میں باہم منظم کی تھیں، اس مرحلے کی تکمیل کے بعد نہ کبھی تباہ ہو سکتی تھیں اور نہ پھر تخلیق۔

اگلا بلند تر تخلیقی پلان، یعنی نباتاتی حیات، طبعی قوانین کے اٹل ہو جانے کے بعد ایک علیحدہ، اپنے دائرہ کار میں بند سسٹم کی حیثیت سے شروع ہوا۔ اس مرحلے میں حرکت کا مخصوص انداز اور اس کے اپنے آلات جو نباتاتی اجسام نے ہم آہنگ کر کے ایک وجودی اکائی کی شکل میں مربوط کیے، سابقہ تخلیقی مراحل سے مختلف تھے، کیونکہ نباتات کی شعوری سطح ان مراحل سے بلند تر تھی۔ تاہم کیونکہ نباتاتی مرحلے میں حیات ابھی خود سے آگاہ نہ تھی لہذا اس نے اپنی شعوری اقدار کو طبعی قوانین کے تناظر میں ایک مختلف رد عمل پیدا کرتے ہوئے زندہ اجسام کے ماڈل کے طور پر پیش کیا اور اپنی حرکت پذیری کے انداز کو اپنی نئی شعوری اقدار کے مطابق کنٹرول اور استعمال کیا۔ اس طرح اس نے پتوں کی درست تناسب میں لائین اور خطوط، شکلیں اور ہیئتیں اور رنگوں کے مناسب شیڈز اور پھولوں کی شکلیں اور خوشبوئیں وغیرہ متعارف کرائیں۔ حیات کے نباتاتی مرحلے کی سرگرمیاں اور حرکت پذیری نے پودوں کی شعوری اقدار کی سطح پر رد عمل ظاہر کیا، جس نے خود مکتفی اجسام کی طرح اس مرحلے میں اپنی شعوری اقدار کے تعین کے لیے کام کیا۔ یہاں بھی پودوں کے اجسام میں

موروثی طور پر موجود میکیزم نے آلات کا کام کیا اور ہر پودے نے اپنی شعوری سطح کے مطابق حرکت کا انداز اپنایا۔

نباتاتی مرحلے کے تکمیل پا جانے کے بعد حیات حیوانی مرحلے میں داخل ہوئی۔ یہاں پھر ایک بار اپنے بلند تر جبلی پلان کے مطابق ہر حیوان نے اپنے طبعی آلات تعمیر کیے، مثلاً اعضاء، ٹانگیں، آنکھیں، جڑے، پنچے وغیرہ جو کہ حیات کی اس مخصوص شعوری سطح کے عین مطابق تھے۔ حیوانات نے ان آلات اور ان کی حرکت کو کنٹرول کیا حتیٰ کہ وہ آلات جو ان کے جسم کے اندر واقع تھے، مثلاً دل، پھیپھڑے، گردے، معدہ وغیرہ، وہ بھی حیوانی زندگی کے مجموعی مقاصد کے مطابق باہمی ربط کے ساتھ اور کنٹرول کے تحت حرکت پذیر ہوئے۔

اس طرح اجسام کے آلات اور ان کی حرکات ہر تخلیقی پلان کے مجموعی مقصد نے متعین کیے، اور یہ سب تخلیقی پلان مزید ایک مجموعی مقصد واحد نے متعین کیے جو تمام کائنات کی وسعتوں میں ایک متحدہ نظم یا متحدہ پلان کی حیثیت میں سرایت کیا ہوا تھا۔ فزکس دان اس واحد یا متحدہ توانائی کے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو توانائی کی اُن تمام اشکال کو کنٹرول کرتا ہے جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاہم وہ افسوسناک طریقے پر اس حقیقت سے لاعلم ہیں کہ توانائی کی خصوصیات یا حقیقت میکائیکل نہیں۔ اس کی حقیقت شعور [consciousness] ہے۔ لہذا کائنات کی وہ واحد کنٹرول کرنے والی مربوط توانائی کوئی اور نہیں بلکہ شعورِ مطلق یا وجودِ مطلق ہے۔ اور یہ اُسی کا سوچا سمجھا مقصد یا اس کے شعور کی کاروائی ہے جس نے تمام تخلیق کو مقصدیت دی۔ یہ کوئی موروثی خاصیت رکھنے والی یا میکائیکل توانائی نہیں ہے جیسا کہ یہ فزکس دان سمجھتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر جسے ہم توانائی کہتے ہیں یہ دراصل شعورِ مطلق کا شعوری ارادہ یا مقصد ہے جو ان چارجڈ [charged] یا برقیائے ہوئے ذرات کی شکل میں نمودار ہوا جن کی حرکت روشنی کی رفتار تھی۔ جوں جوں تخلیق نے قدم بہ قدم پیش قدمی کی، اپنے دائروں میں بند خود مختار نظاموں یا تخلیقی مراحل کی شکل میں، حیات یا شعور اپنے خالق کے لیے ایک ردِّ عمل کے برقیے یا کشش کے ابھار کی صورت میں نمودار ہوا جو اپنے خالق کے لیے محبت اور کشش کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی تمام خصوصیات اور اوصاف خالق کے ودیعت کردہ ہیں۔ حیوانی مرحلے تک زندگی نے خود آگہی حاصل نہیں کی تھی اس لیے آلات و اوزار جو حیات کی اُس شکل نے استعمال کیے فطرت نے ترتیب دیے تھے، اور جو نتائج حاصل کیے جانے تھے وہ خالق نے خواہش کی تھی۔ پھر بھی حیات نے ان مراحل تک، جس پیمانے پر بھی وہ اپنے خالق کا احساس کر پاتی تھی، خود اپنے ارادے سے جدوجہد اور تعاون کیا۔ انسانی مرحلے پر حیات اپنے خالق سے براہِ راست آگاہ ہو گئی اور خود اپنی ذات سے بھی۔ یہاں انسان نے اپنی عظیم تر اور آفاقی روشنی میں عالمی آزادی سے لطف اُٹھایا۔ لہذا انسان ان نتائج کے حصول میں جو خالق نے متعین کیے ہیں فزوں تر حصہ لیتا ہے۔ اسی لیے وہ ساز و سامان جو انسان نے بنایا ہے، موروثی جسمانی آلات تک

محدود نہیں ہے جیسا کہ زندگی نے حیوانی مرحلے تک پیدا کیا تھا۔ انسان نے تو اپنے لامحدود اور تشنہ شعوری تقاضوں کو پورا اظہار دینے کے لیے مصنوعی آلات تعمیر کر لیے۔ مصنوعی اور فطری آلات کے فوائد اور نقصانات کچھ ایسا باہمی توازن رکھتے ہیں کہ ان کے طریق کار میں فرق کرنا مشکل ہے۔ حیوانی مرحلے اور ماقبل میں حرکت کے آلات بالکل قریب تھے اور حیات انہیں خود ہی مرمت بھی کر سکتی تھی اگرچہ کہ وہ لامحدود تفصیلی پیچیدگی کے حامل تھے اور ساتھ ساتھ اپنے وظائف ادا کرنے میں شاندار آسانی بھی رکھتے تھے۔ حیوانی آلات کے مقابلے میں انسانی شعور کے بنائے آلات محنت طلب ہیں اور استعمال میں عموماً وقت طلب۔ تاہم یہ بلند سطحی شعور انسان کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ وہ جیسے بھی آلات چاہے تعمیر کرے اور مادے کی جو بھی شکلیں چاہے پیدا کرے۔

مادہ حرکت کے بغیر ناقابل تصور ہے اور حرکت ایک اندرونی تحریک یا مقصد کے بغیر ناممکن ہے۔

اور حرکت تمام تر کشش اور استرداد کے باہمی کھیل پر مبنی ہے۔

کشش اور استرداد [attraction and rejection] حیات یا شعور کے اوصاف ہیں۔

بلند تر شعوری سطحوں پر کشش اور استرداد محبت اور نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

منتخب کرنا اور مسترد کرنا حیات کا بنیادی وصف ہے جو اس کی صفت آزادی کی وجہ سے ہے۔

ایک ایٹم میں کشش اور استرداد کا وصف حیات کے شعوری عمل کو ظاہر کرتا ہے۔

حیات کے درج بالا اوصاف کے ساتھ ساتھ مادے کی تمام اشکال ریاضیاتی علامات کی نمائندگی کرتی ہیں جو ماقبل موجود شعور کے سبب ہیں۔ لہذا تمام تر مادہ حیات کا حامل ہے۔ یہ اپنے قوانین کے ساتھ زندہ ہے جو اس کے تخلیقی مرحلے سے جوڑے اور متعین ہیں۔

جو قوانین کا سموس میں پھیلے ہوئے ہیں وہ اس سے بلند تر نباتاتی مرحلے پر منطبق نہیں ہوتے۔

عین اسی طرح حیوانی حیات کے قوانین انسانی حیات پر لاگو نہیں ہوتے۔

ہر بلند تر خود مکثی نظام میں تخلیقی طریق کار زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اور عظیم تر شعوری کیفیت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ

طریق ہائے کار بالعکس یا اُلٹے رُخ پر نہیں چلائے جاسکتے۔

بلند تر قوانین اُن قوانین پر چھا جاتے اور حکومت کرتے ہیں جو سابقہ مراحل میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

کم تر مراحل کے قوانین اُن قوانین سے لاعلم رہتے ہیں جو بلند تر مراحل میں کام کرتے ہیں۔

اس سے یہ سامنے آتا ہے کہ کائنات میں جاری تمام حرکت پذیری یا عملی کاروائیوں کی پشت پر شعور ہی ہوتا ہے جو رُو بہ

عمل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ مادے کی تمام صورتیں و اشکال شعور ہی کی اشکال کی نمائندگی کرتی ہیں جو علامتوں میں ظاہر کیا

گیا ہے۔

ہر بلند تر مرحلے میں مادے کی یہ علامتیں مختلف اور بلند تر مادی کیفیات کی علامتوں سے تبدیل ہو جاتی ہیں۔  
اس سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخر کار مادے کے کوئی باقیات نہیں رہیں گے بلکہ یہ سراسر تجریدی یا خیالی علامتوں میں  
تبدیل ہو جائیگا۔

انسانی ذات یا روح تو پہلے ہی مادی حالتوں سے ماوراء زندہ ہے اور اسی لیے ان تمام اشکال حیات پر حاوی ہے جو  
کائنات کے طول و عرض میں مختلف مادی علامتوں میں تخلیق کی گئی ہیں۔



## حرکت [motion]

اب ہم مختصراً حرکت کی مجموعی خصوصیات زیر بحث لاتے ہیں۔ حرکت ہی حیات کی علامت اور اس کے وجود کا ثبوت ہے۔ حرکت اپنی غیر موجودیا ”لا“ [nihil] کی حالت سے یکدم نمودار ہوتی ہے اور بیرونی دنیا کی تخلیق کر دیتی ہے۔ حرکت کی وہ پہلی شکل جو روشنی کے پھوٹنے کی صورت نمودار ہوئی، اس نے ہماری کائنات کی بنیادیں استوار کیں۔ ہر اُس کاروائی کے ساتھ جو ہر ایک حرکت کے ہر قدم کے ساتھ تخلیق ہوتی رہی، خالق کی صفات رکھنے والے اُس کے مثالی پیکر نے اپنے پوشیدہ امکانات کو ظاہر کرنے یا اپنی غیر مادی کیفیتوں سے نمودار ہونے کے عمل کو بتدریج اور مستقلاً جاری رکھا۔ اس طرح نہ صرف یہ خارجی دنیا عدم وجود کی حالت سے وجود میں آئی، بلکہ مسلسل جاری تخلیقی عمل کے ساتھ زمان و مکان بھی پیدا ہوئے۔ لہذا زمان و مکان [time and space] شعورِ مطلق کی تخلیقی کاروائی کا نتیجہ ہیں۔ حتیٰ کہ مادی مراحل میں بھی حیات کی تمام کاروائیاں اپنی پوشیدہ یا غیر مادی حالت سے نمودار ہوتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ حیات یا شعور غیر مادی ہوتا ہے اور یہ ہمارے طبعی حواس کے ادراک میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف اپنے طرزِ عمل اور رویوں کے ذریعے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

وہ تمام تخلیقی کام جو ہم کائنات میں سرانجام ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ان کا ماخذ شعورِ مطلق کی ذات میں ہے۔ اس کے نتیجے میں تخلیق جیسے بھی وہ ظہور میں آئی ہو، اپنے خالق کے لیے ایک فطری میلان یا کشش رکھتی ہے۔ کشش حیات کا ایک فطری وصف ہے اس لیے جہاں بھی کشش ہے وہاں حیات بھی موجود ہے۔ اس طرح حیات تخلیق کے ہر مرحلے میں موجود ہے اور یہ اپنے باطن میں بطور ایک مرکزہ [nucleus] مستحکم رہتی ہے۔ یہ ایک ایٹم میں بھی موجود ہے، ایک پودے میں بھی، ایک حیوان میں بھی مادی مراحل میں، اور ایک ذات یا روح کی شکل میں انسانی مرحلے میں بھی۔

کائنات میں حرکت یا عملی تحریک دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حرکت دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جس میں خالق اپنی تخلیق کے لیے کارفرما ہوتا ہے۔ اور دوسری وہ ہے جس میں تخلیق [حیات] اپنے خالق کی تلاش میں کارفرما ہوتی ہے، لیکن اسی حد کے اندر جس قدر کہ اُس نے اپنے خالق کی آگہی حاصل کی ہے۔

درحقیقت تخلیق کا ہر عمل ایک محبت کا اور اظہارِ ذات کا عمل ہوتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے اور دیکھیے اقبال نے عشق کی

اصطلاح سے اسی محبت اور کشش کے جذبے کو کس خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے:

عشق سے پیدائے زندگی میں زیرو بم      عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

عشق کی مستی سے پیکرِ گل تابناک	عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ	عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ	عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضرات سے نعمتِ تاریخات	عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

کیونکہ تخلیق کے ہاں مرکزِ نگاہ، یا کشش کے ارتکاز کا نکتہ، اس کا خالق ہوتا ہے اس لیے تخلیق خالق کے لیے اپنے فطری تقاضہ محبت کو اسے تلاش کرنے اور اس سے پیار کرنے میں آسودہ دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ جوں جوں تخلیق قدم بقدم پیش قدمی کرتی رہی، یہ اپنے خالق سے زیادہ سے زیادہ روشناس ہوتی رہی۔ تخلیق کے ابتدائی مراحل میں، یعنی کاسمک مرحلے میں، حیات اپنے خالق سے بہت کم آگاہ تھی، اسی لیے اس مرحلے میں زندگی غیر شعوری طور پر خالق کے ارادے کے مطابق کام کرتی رہی۔ اس سے خالق کے لیے اُس کی جبلی کشش ظاہر ہوتی رہی۔ بالفاظِ دیگر، کائناتی مرحلے میں جو ان گنت کہکشاؤں اور نظامِ مہائے شمسی کی صورت میں نمودار ہوا، کائنات کی کاروائی خود بھی جزوی طور پر خود کو تنظیمی انداز میں منظم کرنے کی ذمہ دار تھی جیسا کہ خالق نے اس کے لیے ارادہ کیا تھا۔ یہ اُس مرحلے پر حیات کے سخت گیر رویے اور رد عمل سے ثابت ہے۔ سیارہ زمین کے اگلے بلند تر مرحلے میں طبعی قوانین نے بھی رضامندی سے جزوی طور پر خود ایک نظام کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو حاصل کیا، جیسا کہ خالق کی مرضی تھی۔ اس طرح بالکل ابتدائی مراحل میں تخلیق میں موجود خالق کی خواہش کے شعوری یا غیر شعوری اتباع کے فطری تقاضے نے دراصل جزوی طور پر اپنے اندر موجود خالق کی محبت اور کشش کے جذبے کو آسودگی عطا کی۔ آئندہ بلند تر مراحل میں یعنی نباتاتی اور حیوانی مراحل میں حیات اپنے خالق سے زیادہ آگاہ ہو گئی تھی اس لیے اسی کے مطابق خالق کی محبت کے جذبے کو آسودگی بخشنے کے لیے اس کی تخلیقی کاروائی زیادہ شعوری اور اپنی نوع میں رضا کارانہ تھی۔

## آخر تخلیق کیوں؟

یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ پھر وہ ذاتِ مطلق آخر تخلیق کرتا ہی کیوں ہے۔

شعورِ مطلق کیونکہ خود میں یکتا ہے، اس لیے اس کی شخصیت لازماً غیر محدود و صفات کی مالک ہے۔ جیسا کہ لفظ صفت [attribute] سے ظاہر ہے، یہ کچھ ایسی چیز ہے جو اپنے حامل یا مالک کے لیے ایک کشش اور لگاؤ [attraction] رکھتا ہے۔ ان صفات کے اظہار و نمود کے ساتھ شعورِ مطلق خود کو منکشف کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اظہارِ صفات شعورِ مطلق کا فطری تقاضہ یا خواہش ہے جس کے ذریعے وہ

اپنے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی صفات کے اظہار کے بغیر شعورِ مطلق اپنے مقصد کی بار آوری نہیں کر سکتا۔ شعور ایک یگانہ مرکزی وجود کی حیثیت میں رہتا ہے جسے ہم خودی یا شخصیت کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ حیات جو اپنی صفات کے لیے ایک وجود یا ایک مرکزی کشش کے طور پر زندہ رہتی ہے، اسی طرح صفات امکانی حالت میں ذات کے اندر موجود رہتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر خودی یا ذات روح ہے تو اس کی صفات موروثی طور پر اس کے اندر موجود ہوتی ہیں، جیسے کہ اس کا ”جسم“۔ خودی یا شخصیت خواہ وہ آسمانی ہو یا انسانی، اپنی صفات کے ساتھ ایک وحدت میں لازم و ملزوم کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ صفات ذات کو اپنے اظہار کے لیے مائل کرتے ہیں، اور ذات ان کی چاہت سے قوت پا کر اپنی خوبصورتی اور اپنے امکانات کی نمائش کرنے کے لیے اپنا اظہار کرتی ہے۔

خود کو اس طرح اپنی صفات کے اندر منکشف کر کے خودی/ذات اپنی قوت اور آسودگی حاصل کرتی ہے اور جب منکشف ہوتی ہے تو اپنے باطن سے ذات کے لیے محبت اور کشش کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح تخلیق خالق کی ایک اندرونی خواہش ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے سحر اور اپنے حسن کا مشاہدہ کرتا ہے، مختلف النوع خوبیوں اور لامحدود امکانات کے تناظر میں۔

## حیوانی وجود کی طبیعی موت اور لافانی شعوری ذات

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جو ہر ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

آئیے قارئین اب تحقیق کی اُن ٹھوس حدود میں داخل ہو جائیں جہاں یہاں سوال اپنے منطقی اور حتمی حل کو پہنچ جائے کہ انسانی طبیعی یا حیوانی وجود کس طرح حقیقی انسانی وجود سے، جو کہ شعور ذات کے بلند درجہ کا حامل ہے، کس کس انداز میں یکسر مختلف ہے، اور کیوں کہ حیاتِ آخرت کے بلند تر مرحلے میں منتقل ہو جانے کا مکلف و مستحق ہے۔

تحقیق کچھ خشک ضرور محسوس ہوگی، قدرے طویل بھی ضرور ہے جیسے کہ ماقبل میں معذرت بھی کی گئی، لیکن توجہ سے کئی بار ملاحظہ فرمانے کا نتیجہ حرفِ راز سے کامل شناسائی کی صورت میں تسکینِ قلب و جاں کا سامان ہوگا۔ اور اذہان میں حیاتِ آخرت کے وجود کے بارے میں کسی پہلو سے بھی کوئی غیر یقینی کیفیت باقی نہ رہ جائیگی۔

انسانی حیات کو حیوانی حیات سے مطابقت دینے اور اسے بھی جہلتوں کے تابع ثابت کرنے والوں کے لیے اس جدید علمی بحث میں عظیم نشانیاں ہیں۔ نیز انسانی حیات کو فانی سمجھنے اور حیاتِ آخرت کا انکار کرنے والوں کے لیے یہ بحث ایک فاش گمراہی کے حتمی رد کے لیے اتمامِ حجت کا درجہ فراہم کرنے کا باعث ہوگی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ اس کے آخر میں کہیں سے بھی فنا کی تائید میں کوئی بھی اور استدلال پیش نہیں کیا جاسکے گا۔ اور حیاتِ انسانی کی فنا کے مدعیین اس حسرتِ ناتمام کو لیکر ایک خاسر و نامراد انجام کا انتظار فرمائیں گے۔ البتہ خالق کی محبتیں اور رحمتیں بے پایاں اور ابدی ہیں۔ اس کی راہنمائی اور رجوع کے درمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ تو آئیے معزز قارئین، ایک خالص علمی اور فنی [technical] تبادلہ خیالات کی سمت قدم بڑھاتے ہیں۔

تخلیق کی انسانی سطح پر آدمی اپنے اُس خون اور گوشت سے بنے جسم میں نہیں رہتا جسے عمومی طور پر انسانی جسم کہا جاتا ہے۔ یہ جسم دراصل حیوانی مرحلہ تخلیق سے نسبت رکھتا ہے کیونکہ اس کی شعوری اقدار بالکل وہی ہیں جو ایک حیوانی جسم کی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جہلتیں جو انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں بالکل وہی ہیں جو حیوانی طبیعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔ جذبہ جنس، خوراک کا حصول، مادرانہ محبت اور دیگر جہلتیں، جیسے کہ محاذ آرائی، فرار، پناہ، وغیرہ، دونوں جسمانی نظاموں میں مشترک ہیں۔ انسانی جسم کے خلیے مرتے اور از سر نو تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دہائی میں یہ مکمل طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی جسم کے خلیے بھی مرتے رہتے، دوبارہ تعمیر ہوتے اور پرانے نئے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور جسم نوزائیدگی سے جوانی کی طرف اور جوانی سے

بڑھاپے کی طرف سفر کرتا رہتا ہے۔

جہاں تک شعوری اقدار کا تعلق ہے، وہی حسیات حیوانی جسم کا تعین کرتی ہیں جیسی کہ انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں، بنیادی ضروریات جیسے کہ پناہ گاہ، خوراک، رہنے کے لیے سازگار ماحول اور تکلیف، بیماری سے بچاؤ، دونوں طبعی اجسام میں مشترک ہیں۔

حیوانی طبعی جسم ایک حسیاتی تنظیم کی شکل رکھتا ہے۔ جرثومے کی منتقلی کے ذریعے پیدائش کا عمل سرانجام دیتا ہے اور پھر، خلیات کے کمزور پڑ جانے یا ٹوٹ پھوٹ جانے کے ساتھ یہ جسم بھی غیر مستحکم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طبعی حیات جو جسم کو کنٹرول کر رہی ہوتی ہے، اس کی موت کے ساتھ ہی معدوم ہو جاتی ہے۔

انسان کے طبعی جسم کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ یہ بھی جرثومے کے ذریعے پیدائش کرتا ہے۔ ایک مکمل جسم کی شکل میں ترقی پاتا ہے اور پھر اس کی عضویاتی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ہی اس کی طبعی کارکردگی ختم ہو کر انجام پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ شعوری اقدار جو انسانی طبعی جسم کا تعین کرتی ہیں وہی ہیں جو حیوانی طبعی وجود کا تعین کرتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان بلند تر شعوری سطح پر رہتا ہے، دونوں قسم کے طبعی وجودوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، ہمیں اس یقین کی طرف دھکیلتی ہے کہ آدمی بھی فقط ایک حیوان ہے جو اسی طرح جرثومے کی پیدائش ہے۔ مکمل طبعی جسم میں ترقی پاتا ہے اور پھر اپنے طبعی جسم کی شکست و ریخت کے ساتھ زندگی سے محروم ہو جاتا ہے، جس طرح حیوانات کا معاملہ ہے۔ اس بنا پر کسی حیات بعد الموت کا تصور کرنا حماقت پر منطبق ہے۔

تاہم یہ درست نہیں ہے۔ یہ نظریہ گمراہ کن ہے۔ اگر ہم حیات کے تخلیقی طریق کار کو مد نظر رکھیں تو ہمیں یہ علم ہو گا کہ دراصل یہ طبعی وجود یا جسم نہیں ہے جو حیات کو تشکیل دیتا ہے۔ بلکہ یہ تو حیات ہے جو اس شعوری مرحلہ تخلیق کے مطابق جس میں وہ اپنا وجود رکھتی ہے، اپنے گرد جسم کو نشوونما دیتی ہے۔

اگر یہ خود حیات نہ ہوتی جو اپنی شعوری سطح کے مطابق ایک جسم کی تشکیل کرتی، تو ہم کیسے یہ توقع کر سکتے تھے کہ صرف ایک جسم از خود حیات کی مختلف النوع اور ہمہ جہت اقدار کا علم رکھے اور ان کی تشریح بھی کر سکے۔۔۔ اس حیات کا جو ایک اکائی کی شکل میں زندہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیقی طریق کار کے تحت حیوانی مرحلے کی تکمیل بہترین حیوانی شکل میں اس نکتہ پر ہوئی جسے ہم انسانی جسم کہتے ہیں۔ آدمی کا طبعی جسم پوری حیوانی دنیا میں ایک تخلیقی شہ پارہ ہے کیونکہ حیوانی مرحلے نے اپنے بہترین تناسب میں اور بلند تر ترتیب میں اپنی اقدار انسان کے طبعی جسم میں مکمل کی ہیں۔ یہی حقیقت کہ انسانی جسم تمام حیوانوں سے زیادہ خوبصورت ہے، ہمارے اس نظریے کو قوت دیتا ہے کہ وہ حسی اقدار جو انسانی وجود میں حاصل کر لی گئیں، وہ حیوانی مرحلہ حیات میں اپنے مکمل تناسب کے باوجود،

پہلے کبھی کسی اور حیوان میں حاصل نہیں کی گئیں۔

تخلیق کے بنیادی قانون کے مطابق ایک مخصوص مرحلے پر شعوری اقدار کی تکمیل پر، حیات نے، جس نے اُس مرحلے پر اپنی ابتدا کی تھی، اب لازمی طور پر ایک بلند تر تخلیقی درجے پر ایک نئے مرحلے کے روپ میں دوبارہ شروعات کرنی ہوتی ہیں۔ تخلیق کے اولین اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قطعی واضح ہے کہ انسانی مرحلے پر آدمی کی شعوری اقدار، بمقابلہ سابقہ مرحلے کی اقدار کے، لازماً نہ صرف معیار میں بلند تر ہونی چاہئیں بلکہ یہ اقدار اپنی نوع میں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بلند تر اقدار صرف معیار میں مختلف ہوگی تو پھر ایک نیا مرحلہ تخلیق کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ زندگی اُسی مرحلے پر جاری رہے گی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ انہی اقدار کے بلند تر معیارات حاصل کر لے گی۔

نئی بلند تر شعوری اقدار پر مبنی نئے مرحلے کی ابتدا کے نتیجے میں یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ بلند تر زندگی اپنے ساتھ ایک منفرد اور بلند تر عملی جسمانی ساخت بھی ساتھ لے کر آئے تاکہ وہ اپنی حاصل کردہ شعوری سطح کے مطابق اپنی اقدار کی نمود کر سکے۔ لہذا اگرچہ کہ انسانی ذات حیوانی جسم کے ساتھ منسلک رہتی ہے، مگر یہ دراصل اپنی ذہنی کیفیت یا ذہنی جسم میں زندہ رہتی ہے جو کہ ایک ایسا جسم ہے جو بجائے سابق مراحل حیات کی طرح مادی نمونوں کی علامتوں پر بنائے جانے کے، خالص شعوری یا تجریدی علامتوں پر تراش کر بنایا گیا ہے۔

اس باب میں اب ہم انسانی مرحلہ حیات کی شعوری اقدار کو زیر بحث لائیں گے تاکہ ہم یہ جائزہ لے سکیں کہ انسان کی شعوری اقدار کس طرح اپنی نوع میں سابقہ حیوانی مرحلے کے مقابلے میں مختلف ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ انسان بالکل مختلف قسم کی اقدار کے ساتھ زندہ ہے تو یہ حقیقت ہمیں دور رس نتائج مہیا کرے گی۔ ہم خاص طور پر یہ ثابت کر سکیں گے کہ انسان اپنی طبعی یا حیوانی وجود میں نہیں رہتا اور اس لیے وہ قوانین جو حیوانی اجسام پر منطبق ہوتے ہیں وہ انسان کے شعوری وجود پر منطبق نہیں ہوتے۔ یہ تجزیہ اپنی نوعیت میں بہت ہی چونکا دینے والا ہوگا کیونکہ جیسا کہ ماقبل کی تحقیق میں کہا گیا، اگر یہ ثابت ہو گیا کہ آدمی حیات کے ایک بلند تر درجے پر فائز ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ لازماً اپنی ذہنی کیفیات یا مجرد شعوری جسم میں زندہ ہے جو کہ شعور کی مادی حالتوں سے یکسر مختلف ہے۔ تو آئیے تجزیے کا آغاز کرتے ہیں:-

[۱] جب ہم ان شعوری اقدار پر غور کرتے ہیں جو حیوانی مرحلہ حیات اور انسانی مرحلہ حیات میں ظاہر ہوتی ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ حیوان مکمل طور پر حیات کی مادی حالتوں سے پیوستہ رہتا ہے، جیسے کہ ایک مچھلی سمندر میں۔ وہ نہ تو حقیقتِ مطلق سے آگاہ ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں انسان ایک ایسی حالت شعور میں رہتا ہے جہاں مادی کیفیات کا بھاری پردہ چاک ہو چکا ہے اور جہاں اسے حقیقتِ مطلق کی ایک راست بصیرت دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ خود کو جاننے پر بھی قادر ہے۔

یہ ایسے ہی ہے گویا کہ وہ تخلیق کی مادی سطح سے برآمد ہو کر شعوری دنیا میں جنم لے چکا ہے جہاں ذاتِ مطلق کا راست احساس رکھنے کی وجہ سے وہ خود آگاہی حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ یہ اس طرح ہی ہے جیسے وہ مادی سطحِ تخلیق سے نکل کر اپنی شعوری حالتِ پیدائش میں آ گیا ہو جہاں ذاتِ مطلق کی آگاہی نے اسے خود آگاہی کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ جس طرح ایک حیوان اپنے اعضاء اور جسم کا علم رکھتا ہے، اور اپنے ارد گرد کے ماحول کا بھی، اسی طرح انسان اپنی شعور ذات کے سبب نہ صرف اپنے اعضاء اور قریبی ماحول کو جانتا ہے بلکہ اس کا علم تمام کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اپنی شعور ذات کی وجہ سے خود سے ایک مختلف شخصیت کے روپ میں آگاہ ہے جو کہ تمام کائنات سے علیحدہ اور ممتاز وجود رکھتی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ کوئی حیوان خود کو اس طریق پر جاننے کے قابل نہیں ہے۔ مزید برآں، شعور ذات کے ذریعے انسان اس قابل ہے کہ اپنی ذہنی کیفیات کو شعوری اشیاء کی طرح ہینڈل کر سکے۔ حیوان جو فقط ایک تنظیمی ڈھانچے کی سطح پر زندہ ہے، اپنی مادی حالتِ شعور میں ڈوبا رہتا ہے اور یہ اپنے تصورات میں اس حالت سے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی شعوری اقدار نہ صرف حیوانوں سے بلند تر ہیں بلکہ ان سے یکسر مختلف بھی ہیں، بلکہ یہ پوری کائنات میں منفرد ہیں۔ اپنی شعوری ذات کی خوبی کی وجہ سے انسان جو کچھ بھی تعمیر کرتا ہے وہ اپنی نوعیت میں بالکل منفرد طور پر انسانی سطح رکھتا ہے۔ مثلاً زبان وہ مفعول ہے جس کا فاعل شعور ذات ہے۔ شعور ذات اور زبان باہم ناگزیر ہیں کیونکہ یہ ایک گل کے دو نصف ہیں۔ اور یہ انسانی مجلسی زندگی کے کردار، اداروں اور فنون کے لیے ناگزیر ہیں۔ اگر کوئی حیوان بھی شعور ذات رکھتا، تو وہ اس صلاحیت کی بنیاد پر زبان کا ایک ڈھانچہ ضرور تعمیر کر لیتا جیسا کہ انسان نے کیا ہے۔ لیکن کسی حیوان نے ایسا نہیں کیا۔ لہذا ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی حیوان خود سے آگاہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی شعوری اقدار منفرد ہیں اور ان تمام شعوری اقدار سے بالا ہیں جو کائنات کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی حیات میں نمایاں ہوتی ہیں۔

[۲]

حیوانی وجود جہتوں کے دباؤ کے تحت عمل پذیر ہوتا ہے۔ یہ امر حیوانی مرحلہ تخلیق سے ماقبل کے طبعی مراحل سے مماثلت رکھتا ہے جہاں حیات ایک نیم شعوری کیفیت میں ”سبب اور نتیجے“ [cause and effect] کے تسلسل میں کام کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانی وجود جہتوں کا اسیر رہتا ہے کیونکہ حیوان خودی یا شخصیت کا مالک نہیں ہوتا۔ ذات یا شخصیت سے محرومی کا مطلب یہ ہے کہ وجود بھی تکمیل سے دور ہے اور نامکمل ہوتے ہوئے یہ اپنے ماخذ یا خالق کی ذات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اور یہ ہمیشہ صرف اپنے ماخذ کے حوالے سے ممکن ہوتا ہے کہ زندگی خود کو جان سکے۔ اس راست احساس کی عدم موجودگی میں حیات صرف اپنے مادی اور غیر نشوونما یافتہ حالتوں میں رہتی ہے جہاں یہ مثالی علامتوں کے ذریعے غیر شعوری طور پر مصروف کار رہتی ہے۔ اس کے برخلاف جہاں بھی ضروری ہو، انسان جبلی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے جو اس کے طبعی یا حیوانی

[۳]

وجود سے ابھرتی ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے مادی جسم سے بالکل آزاد ایک علیحدہ جسم میں رہتا ہے۔ یہ جسم جو انسانی ذات نے اس طرز پر تشکیل دیا ہے، لازماً مادی یا غیر ارتقاء یافتہ [crude] حالت حیات سے بلند ہے۔ مناسب الفاظ کی غیر موجودگی کے سبب ہم اسے انسانی ذات کا ”ذہنی جسم“ کہہ سکتے ہیں۔

حیات انسانی شعور ذات کے مرحلے سے قبل ایک ابتدائی غیر ترقی یافتہ حالت میں تھی اور ذہنی لحاظ سے خود سے آگاہ نہ تھی۔ ان مراحل میں طبعی وجود کی کارکردگی اسباب اور نتائج کے تسلسل سے انگلیخت ہوتی تھی۔ سبب و نتیجہ کی کارروائی بہتر طور پر اس طرح سمجھی جاسکتی ہے جیسے کہ حیات خوابیدہ ہو اور کوئی سبب اسے عمل کے لیے اُکسائے یا تقاضہ پیدا کرے۔ تاہم انسانی مرحلے میں انسان کسی بھی سبب سے انگلیخت ہونے سے انکار کر سکتا ہے اگر ایسا ارادہ کر لے۔ اگر کوئی سبب اسے عمل کے لیے متحرک کرے وہ اسے مسترد بھی کر سکتا ہے اور کسی اور وقت کے لیے موخر بھی۔ انسان کا یہ انتخاب کہ وہ ایک وجہ کو مسترد یا موخر کر دے، اور دوسری پر عمل درآمد کرے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر انسان کسی سبب کے تحت عمل درآمد کا انتخاب کرتا ہے تو وہ ایسا خود اپنی آزاد مرضی سے کرتا ہے۔ مثلاً اگر ایک حیوان بھوکا ہے تو وہ اپنی کھانے کی جبلت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہذا جب تک کھانہ لے چین سے نہیں بیٹھے گا۔ لیکن انسان کے معاملے میں، اگر انسان چاہے تو وہ اس جبلتی تقاضے کے خلاف بھی جاسکتا ہے اور اسے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھ سکتا ہے۔ یہاں بھی کسی دوسرے وقت کا انتخاب انسان کی آزاد مرضی و ارادے کے ہاتھ میں ہے۔ پس، پہلے مرحلے میں انسان کھانے کے جبلی دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اگر وہ چھلکتا بھی ہے تو وہ یہ عمل اپنے آزاد ارادے سے کرتا ہے۔ یعنی اس حالت میں بھی انسان خود ہی وہ وقت منتخب کرتا ہے جو اسے موزوں لگتا ہے۔ یہ اس کائنات میں ایک منفرد واقعہ ہے کہ یہاں زندگی اپنے آزاد ارادے سے بہت سے اسباب میں سے ایک کو منتخب کرتی ہے۔ ایک اور ناقابل فراموش نکتہ یہ ہے کہ انتخاب کے وقت کا تعین انسان نے زمانہ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے، مستقبل کے لیے کیا ہے۔ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے وقت کا انتخاب صرف وہی ذات تصور میں لاسکتی ہے جو خود آگاہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے کسی فائدے کو دیکھ پانا ایک سبب صرف اُس وقت بن سکتا ہے جب انسانی ذات مستقبل میں چھپے فوائد کا ادراک رکھتی ہو اور اس طرح یہاں تحرک کا سبب خود فاعل ہی پیدا کر رہا ہے۔ یہ جیسا کہ پہلے بھی زور دیا گیا، ایک منفرد وقوع ہے۔ ہم ساری کائنات میں کوئی ایک بھی سابقہ مثال ایسی نہیں پاتے کہ جہاں کسی فاعل نے خود ہی عمل کے لیے خود مختاری کے ساتھ ایک سبب پیدا کیا ہو۔ بالفاظِ دیگر، یہ صرف خود آگاہ انسان ہی ہے جو فاعل ہونے کی حیثیت سے خود اپنا سبب پیدا کرتا ہے اور پھر اس سبب کے نتائج بھی اپنی آزاد مرضی سے قبول کرتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیوان نے اپنی جبلت کی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن جانور یہ صرف ایک زیادہ طاقتور جبلت کے دباؤ کے تحت کر پاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک جانور اپنی کھانے کی جبلت کی تسکین کر رہا ہے اور اچانک ایک



آدمی اس پر حملہ کر دیتا ہے، جانور بھاگ جائیگا۔ درحقیقت یہاں کھانے کی جبلت کی خلاف ورزی کا سبب ایک زیادہ طاقتور، جان بچانے کی جبلت ہے۔ مذکورہ صورت حال میں حیوان بمقابلہ ایک قدرے کمزور کھانے کی جبلت کے ایک قوی تر فرار کی جبلت کے زیر اثر آ گیا۔ اگر حیوان نے فوری فرار کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا تو اس کی جان ضائع ہو جاتی۔ لہذا یہاں جانور نے فوراً ایک قوی تر، جان بچانے والی جبلت کی تسکین کرتے ہوئے تحفظ کا راستہ اختیار کیا۔ ان دونوں حالتوں میں جانور مکمل طور پر آزاد نہیں تھا۔ وہ صرف جبلتوں کے دباؤ کے زیر اثر رہا۔

[۶] حیوان کبھی اپنی جبلتوں کی ضرورت سے زیادہ تسکین کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ وہ جبلتوں کی تسکین بالکل ان کی طبعی ضروریات کے مطابق کرتا ہے۔ تاہم انسانی مرحلہ پر جبلتوں کی تسکین کی کشش معمول کی ضروریات سے تجاوز کر جاتی ہے جس میں انسان کے خود مختار آزاد ارادے کی جھلک نظر آتی ہے۔

[۷] حیوانی وجود کے خلیات پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور اس طرح ایک حیوان کی طبعی عمر میں اس کا وجود کئی بار تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسان کے آئیڈیلز، فکر اور کارنامے، انسانی ذات کے ساتھ بغیر تبدیلی کے اور مکمل محفوظ حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ ان طبعی تبدیلیوں کے برخلاف جن سے حیوانی وجود بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی اور بڑھاپے تک گذرتا ہے، انسانی تصورات، فکر اور اعمال کا برقرار رہنا ایک مکمل ثبوت ہے کہ انسانی ذات طبعی حالت میں، اس طبعی وجود کے اندر نہیں رہتی جس کے ساتھ وہ اپنے تخلیقی مرحلے میں منسلک ہے۔ اور جو موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

[۸] انسانی دماغ بچپن سے شروع ہو کر ایک مخصوص حد تک ترقی کرتا ہے۔ اُس حد کے بعد مزید ترقی دماغ نہیں بلکہ فرد کا علم کرتا ہے۔ اسی کے مانند حیوانی مرحلے میں نئے انواع کی ظہور کے ساتھ ان کا دماغ ایک مخصوص حد تک ترقی پذیر رہا، جو کہ انسانی زندگی کی شکل بھی ہے۔ انسان میں اس کے بعد یہ نوع یا دماغ نہیں جس کی ہم مزید ترقی کی توقع کریں، بلکہ یہ انسانی شعور ذات ہے جو ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہ امر کہ انسان خود آگاہ ہے اس کا اشارہ ہے کہ شعور کا طبعی آلہ یا عضو، یعنی دماغ، اس کے اندر اپنی کاملیت کو پا چکا ہے۔ بنا بریں، انسان کی مستقبل کی تخلیق اپنا اظہار اپنی خودی کے علم میں ترقی سے کرے گی، اپنے دماغ یا جسم کی مزید اعلیٰ ترقی سے نہیں۔ لہذا یہ واضح ہے کہ انسان ایک خود مختار اور منفرد مرحلے میں رہتا ہے جو حیوانی مرحلہ حیات سے جدا ہے۔

[۹] حیوان کا دماغ حیوانی وجود کی ایک اکائی یا مرکزے کی طرح ایک مادی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن شعور ذات کے مرحلے میں انسانی ذات اس کے حیوانی دماغ میں نہیں رہتی۔ یہ اپنے ”ذہنی جسم“ میں رہتی ہے جو اپنی نوع میں غیر مادی ہے۔ انسانی ذات کے ذہنی جسم کی نشوونما کا ذریعہ علم ہے، جبکہ اس کے حیوانی دماغ یا اس کے حیوانی وجود کی نشوونما اس مادی خوراک سے ہوتی ہے جو مختلف کیمیائی مادوں پر مبنی ہے۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ دماغ اور ذہن کی شعوری اقدار بالکل مختلف ہیں۔ دماغ جو

طبیعی وجود سے متعلق ہے، مادی حالت میں رہتا ہے، جب کہ ذہن یا ذہنی وجود جو شعوری ذات سے متعلق ہے، غیر مادی ہے۔  
بالفاظ دیگر حیوانی حیات مادی حالت میں رہتی ہے اور انسانی ذات یا روح غیر مادی حالت میں۔

[۱۰] انسان نگار بننے میں بے عزتی اور شرم محسوس کرتا ہے۔ انسانی مرحلے کے بالکل ابتدا میں وہ پہلی چیز جس نے اسے کسی غلط [گناہ] کا احساس دلایا وہ اس کی جانوروں کی مانند برہنہ حالت تھی۔ لہذا اس نے اپنے اعضائے تناسل پتوں اور چھال سے چھپالیے۔ یہ ایک مکمل اشارہ تھا کہ انسان نے خود آگہی حاصل کر لی اور ایک روشن تر شعوری روشنی میں وہ براہ راست اپنی ان روحانی اقدار سے روشناس ہو گیا جو حیوانی حیات کی پست اور مادی اقدار سے الگ تھیں۔ اس نے خود کو اپنے اعضائے تناسل کی نمائش کرتے ہوئے پست اور غیر مہذب خیال کیا جو حیات کے حیوانی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انسان کم تر اور مادی حیوانی حالت سے علیحدہ ایک اعلیٰ تر درجے پر رہتا ہے۔

[۱۱] تمام طبیعی نکالیف اور خوشیاں حیوانی وجود سے تعلق رکھتی ہیں۔ طبیعی وجود کی نکالیف اور خوشیوں کے ساتھ کچھ مختلف اور منفرد نکالیف اور خوشیوں کے درجے بھی ہیں جن سے حیوانی وجود کبھی آگاہ نہیں ہوتا، اور جن سے انسان بالکل انفرادی طور پر گذرتا ہے۔ مثلاً انسان کی زندگی کے درست آئیڈیل کے انتخاب میں ناکامی یا سوشل زندگی میں جائز عزت حاصل کرنے میں ناکامی، ایسی نکالیف / دکھ ہیں جن کا طبیعی جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذہنی دکھ زیادہ تر اور انفرادی طور پر صرف انسان میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ حیوانی وجود کبھی ایسے روحانی جذبات سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمیں صاف بتاتا ہے کہ انسان کی شعوری اقدار اور رجحانات منفرد ہیں اور ان شعوری اقدار اور رجحانات سے بلند تر ہیں جو حیوانی وجود میں پائے جاتے ہیں۔

[۱۲] حیوانی وجود سادہ طرز پر ایک نظم کے اندر رہتا ہے تاکہ زندگی کی سرگرمیاں ادا کرتا رہے اور اپنی ذات سے ایک منفرد وجود کی حیثیت سے متعارف نہیں ہوتا۔

[۱۳] حیوانی وجود ایک مخصوص حد تک نشوونما پاتا ہے اور تکمیل تک پہنچنے پر اس کا فریضہ جبلی تقاضوں کی تسکین ہے۔ ان تمام جبلتوں کا مقصد حیات کو اس مرحلے پر محفوظ اور برقرار رکھنا ہے۔ ہر جبلت ایک علیحدہ وظیفہ ادا کرتی ہے اور اپنا ایک علیحدہ دباؤ رکھتی ہے جو جانور کو ایسے عمل کی طرف لے جاتا ہے جو وجود کے تسلسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر جبلت اپنا دباؤ براہ راست وجود پر ڈالتی ہے اور وجود بطور فاعل جبلت کے تقاضے پر جھک جاتا ہے یہاں تک کہ جبلت مطمئن ہو جائے۔ جبلتیں اور وجود ایک ایسی متوازن تنظیم میں رہتے ہیں کہ وجود اور جبلتیں باہم ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر وجود کسی بھی جبلی تقاضے کو آسودہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو انعام میں اسے وجود کے مادی لیول پر حسیاتی لطف انعام کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس صورت میں کہ وجود کسی بھی جبلی تقاضے کو آسودہ کرنے میں ناکام ہو جائے تو جبلت اپنا دباؤ برقرار رکھتی ہے اور وجود ایک مسلسل

بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں طبعی وجود کا جنت اور جہنم اس خوشی اور تکلیف تک محدود ہے جو وجود کی مادی سطح تک پہنچتا ہے۔ وہ حظِ طبعی وجود کھانے یا جنسی عمل کرنے میں اٹھاتا ہے، وہ وہیں تک قائم رہتا ہے جہاں تک وجود کی ان جبلتوں کو آسودہ کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح دکھ اور خوشی کا قریبی تعلق جسم کی مادی حالت سے ہے۔ خوشی کی سطح اور نوعیت ہر جبلت کے ساتھ علیحدہ ہے جو زندگی کی حفاظت اور تسلسل میں اس کی افادیت کے مطابق ہے۔ مثلاً کھانے اور جنس کی جبلت براہِ راست زندگی کے تحفظ اور تسلسل سے جڑی ہیں اسی لیے بڑی خوشی اور کشش ان جبلتوں سے وابستہ ہے۔ وہ عظیم انعام جو وجودِ جبلی لذت سے حاصل کرتا ہے، ان جبلتوں کی تسکین کے لیے وجود کو زیادہ بڑی کوششیں کرنے پر اُکساتا ہے۔ اگر وجود کسی غیر معمولی سماجی حالت یا قحط کے باعث اپنی کسی بھی جبلت کو آسودہ کرنے میں ناکام ہو جائے تو وجود طبعی تکالیف اور دباؤ برداشت کرتا ہے۔ وجود اور بھی زیادہ سنجیدہ کیفیت کا سامنا کرتا ہے جب اسے زندگی کو لاحق خطرے کا سامنا کرنا پڑ جائے، جیسا کہ جسم کو اندرونی یا خارجی زخم۔ ایسی سنجیدہ صورتِ حال میں وارننگ کا سگنل زیادہ مادی ہوتا ہے اور اس کا مقصد وجود کو اس قابل کرنا ہوتا ہے کہ وہ تحفظِ خویش کے لیے فوری تدارک کے اسباب تلاش کرے۔

جبلی لذت یا طبعی تکالیف اور مصائب اپنی نوعیت میں مادی ہوتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس، خوشی اور مسرت اور

[۱۴

ذہنی تکلیف جیسے کہ پریشانی اور غم وغیرہ انسان کی شعوری ذات یا شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ خوشی کا احساس ذہنی تکلیف ہی کی طرح اپنی نوعیت میں روحانی ہے کیونکہ ذات یا شخصیت اپنے ماخذ کی پہچان کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ کیونکہ انسانی ذات زیرِ تکمیل ہے اس لیے یہ اپنے ماخذ کو آئیڈیلز کی شکل میں تلاش کرتی ہے۔ اگر ذات اپنے مثالی پیکر کی تلاش میں کامیاب ہو جائے تو یہ خوشی محسوس کرتی ہے۔ اگر وہ ناکام رہ جائے تو یہ غم اور افسوس کا شکار ہوتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہر انسانی فعل شعوری ذات سے جڑا ہوتا ہے اور ذات تبھی خود آگاہ ہو سکتی ہے اگر وہ اپنے آئیڈیل یا مقصد سے آگاہ ہو۔ یہ آئیڈیل پست ہو یا بلند، صحیح ہو یا غلط، بہر حال ذات کے لیے ایک آئیڈیل ضروری ہے جو اس کی شعوری سطح کے مطابق ہو۔ اگر ایک شعوری ذات ایک آئیڈیل یا مقصد نہیں رکھتی تو وہ شعور ذات کے مرحلے پر نہیں رہ سکتی نہ ہی وہ کسی شخصیت کی مالک ہو سکتی ہے۔ اس طرح انسان کا ہر ایک فعل اس کے آئیڈیل کی تقلید و پیروی میں عمل پذیر ہوتا ہے اور ذات اپنی سرگرمیوں سے مکمل باخبر رہتی ہے۔

[۱۵

اب اگر ہم انسانی ذات کی خوشی اور مسرت کا جبلی لذتوں سے موازنہ کریں اور اسی کے مانند انسانی رنج و غم کا موازنہ جسمانی تکالیف اور دکھ سے کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جبلی لذتیں، مقابلہ انسانی ذات کی خوشیوں اور مسرتوں کے، بہت کم تر ہیں۔ اول الذکر حیات کے طبعی اور مادی پہلو سے متعلق ہیں، اور موخر الذکر حیات کی روحانی حالت سے متعلق ہیں۔ اسی کی مانند جسمانی تکالیف اور زخمِ ذہنی اور روحانی کرب کے مقابلے میں کم تر ہیں۔ بالفاظِ دیگر، حیوانی وجود کے دکھ اور خوشی کی سطح اور شعور ذات کے دکھ اور خوشی کی سطح اپنی شدت میں ہی مختلف نہیں بلکہ اپنی نوعیت میں بھی مختلف ہوتی ہیں اور مختلف قسم کی شعوری

اقدار کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب کہ ایک کی سطح پست، محدود اور مختصر دورانیے کے لیے ہوتی ہے، جبکہ دوسرے کی سطح بلند، غیر محدود اور طویل ہوتی ہے۔

[۱۶] حیوانی وجود کی شعوری اقدار پانچ حیات تک محدود ہوتی ہیں۔ یعنی ذائقے، لمس، سماعت، سونگھنے اور دیکھنے کی حس۔ جب کہ اس کے مقابلے میں انسانی ذات کی شعوری اقدار کی سطح اپنی نوعیت میں غیر مادی ہے اور اس کا سکوپ غیر محدود ہے۔ احساس، عقل، سوچ، وجدان اور تخلیقی صلاحیت وغیرہ، وغیرہ، ایسی شعوری اقدار ہیں جن کے ذریعے شعوری وجود اپنا آئیڈیل حقیقت کی شکل میں دیکھتا ہے۔ طبیعی وجود کی حسیاتی اقدار حیات کی مادی حالت تک محدود رہتی ہیں، لیکن انسانی ذات کی شعوری اقدار، غیر مادی ہوتے ہوئے ایک کائناتی سطح پر کام کرتی ہیں۔ جبکہ حسیات زندگی کی صرف مادی اور کمتر اقدار کا جائزہ لیتی ہیں، انسانی ذات اپنی بلند تر شعوری اقدار کے ساتھ نہ صرف کائنات کے رازوں سے پردہ کھولتی ہے، بلکہ ان کے ذریعے خود کو طبیعی وجود سے ماوراء ایک علیحدہ ذات میں لے جاتی ہے اور اس تقاضے کے تحت جو اپنے آئیڈیل کو زیادہ سے زیادہ دریافت کرنا چاہتا ہے، کائنات کی حقیقت دریافت کرتی ہے۔

قارئین، ان سولہ نکات کو زیر بحث لانے کے بعد ہم اب اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ حیوانی وجود کی حسیاتی اقدار، یعنی پانچ مخصوص حسیات، زندگی کے مادی حالات کو کھوجتی ہیں، جب کہ انسانی ذات کی شعوری اقدار تخلیقی کی مادی حالتوں سے ماوراء حقیقت کی تلاش کرتی ہیں۔ اس لیے چکھنے، لمس، سماعت، بصارت اور سونگھنے کی حسیات شعور کے ترازو میں کم تر ہیں اور یہ کبھی براہ راست شعوری ذات کے تقاضے کو پورا نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انسان کا حیوانی وجود یا طبیعی وجود کبھی زندگی کی مادی حالتوں سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ انسانی ذات کی شعوری اقدار کیونکہ غیر مادی ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ کائنات کی حدود سے ماوراء بھی حقیقت کی تلاش میں مستقل منہمک رہتی ہیں۔ مختصراً، جب شعوری ذات اپنے باطن سے کائنات کا قریب سے مشاہدہ کرتی ہے تو درحقیقت اس کا مقصد زندگی کے اس مادی سفر میں اپنا مقام متعین کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ اپنے حیوانی وجود کی حسیاتی اقدار کا استعمال کرتی ہے۔ تاہم جب وہ کائنات سے ماوراء حقیقت کو دیکھنا چاہتی ہے، تو تب وہ انسانی ذات کی بلند تر سطح رکھنے والی شعوری اقدار کا استعمال کرتی ہے، جیسے کہ احساس، عقل، وجدان، سوچ و فکر، تخلیقی ذہنی صلاحیت وغیرہ۔

درج بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان ایک بالکل علیحدہ کائناتی شعوری مرحلے میں رہتا ہے جو کہ حیوانی وجود کی شعوری سطح سے بہت بلند ہے۔ یہ شعوری اقدار صرف درجے میں مختلف نہیں بلکہ اپنی نوعیت میں بھی مختلف ہیں۔ حیوانی مرحلے کی تکمیل کے بعد جب حیات انسان کی شعور ذات کے مرحلے میں داخل ہوتی تو یہ اس کے حیوانی وجود میں نمودار نہیں ہوتی۔ اس کی بجائے یہ ایک علیحدہ جسم میں ایک بلند تر سطح حیات میں شروع ہوتی۔ اگر اس نے اپنا سفر ایک علیحدہ جسم میں یا وجود میں شروع نہ کیا ہوتا تو یہ حیوانی حیات

کے سابقہ تخلیقی مرحلے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ ارتقائی تھیوری کے ماننے والے یقین رکھتے ہیں کہ انسانی شعور فقط حیوانی شعور کی ایک ترقی یافتہ یا اضافی کڑی ہے۔ اسی سوچ کی وجہ سے وہ انسان کو ایک ”مجلسی حیوان“ کہتے ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق یہ تھیوری گمراہ گن ثابت ہوتی ہے۔ یہ ویسے بھی تخلیق کے بنیادی اصول کخلاف جاتی ہے جس کے مطابق کوئی تخلیقی مرحلہ اپنے اختتام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اُس نے اپنے مرحلے کی وہ مکمل اقدار انتہاء تک حاصل نہ کر لی ہوں۔ اور جب ایک مرتبہ مرحلے کی تمام اقدار حاصل کر لی گئی ہوں تو مرحلہ اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ لہذا حیات کو اس کے بعد ایک نئے پلان پر نئی شعوری اقدار کے ساتھ شروع ہونا ہوتا ہے جیسا کہ خالق نے اس کے لیے منصوبہ بندی یا تعین کیا ہو۔ تخلیق کے اس اہم ترین اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ انسانی خود شناسی کا تخلیقی مرحلہ بھی نمودار ہوا جب حیوانی تخلیقی مرحلے نے اپنی مکمل اقدار انتہاء تک حاصل کر لی تھیں اور کسی بھی مزید تغیر کا راستہ خود پر بند کر لیا تھا۔ لہذا ہم انسانی شعور ذات کے مرحلے کو حیوانی مرحلے کی ایک اضافی کڑی نہیں سمجھ سکتے۔

جب بھی ایک بلند تر زندگی ایک نئے مرحلے میں ابتدا کرتی ہے، یہ اپنے ساتھ ایک فعال نظام یا جسم لے کر آتی ہے جو اُن اقدار سے مطابقت رکھتا ہے جن کا حصول لازمی اور متعین ہوتا ہے۔ درحقیقت حیات بلند تر مرحلہ پر نمودار ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس نے نئے مرحلے سے وابستہ بلند تر اقدار کی نمود اور تحفظ کے لیے ایک علیحدہ جسم تشکیل نہ دے لیا ہو۔ ایک نیا فعال وجود ساتھ لانے کی ضرورت اس سادہ سی وجہ سے ہے کہ بلند تر شعوری مرحلے پر حیات کا تقاضہ ہمیشہ اپنی نوعیت میں مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے یہ اُس حیات کے پہلو پہ پہلو نہیں رہ سکتا جو کمتر اقدار اور مختلف رجحانات رکھتی ہو۔ اگر بلند تر اقدار سابقہ اقدار کے ساتھ رہیں تو حیات کے نئے اور بلند تر رجحانات کی نمود ممکن نہیں ہوگی۔ لہذا اگر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی ذات کی شعوری اقدار بلند تر اور بمقابلہ حیوانی اقدار مختلف النوع ہیں تو انہیں لازماً ایک نئے جسم یا طبعی وجود میں نمودار ہونا تھا جو کہ حیوانی وجود سے مختلف ہوں۔ بلند تر قسم کی شعوری اقدار اور انسانی ذات کے رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان حیوانی وجود کے اندر نہیں رہتا۔ تخلیقی طریق کار کا بنیادی اصول اس نظریے کی مکمل تائید کرتا ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے اپنی ابتدا اپنے خود آگاہ مرحلے میں ایک علیحدہ جسم میں کی اور کیونکہ حیات اپنا فعال وجود اپنی شعوری اقدار کے مطابق تشکیل دیتی ہے، اسی لیے شعوری ذات نے جو حیات کی مادی سطح سے ماوراء رہتی ہے، جو فعال نظام تشکیل دیا وہ بھی لازمی غیر مادی وجود پر مبنی ہونا چاہیے۔ لہذا انسانی ذات اپنے ذہنی وجود میں رہتی ہے۔ یا زیادہ وضاحت سے کہیں تو شعوری ذات اپنی ذہنی حالت میں، مادی حالت حیات سے بلند رہتی ہے۔

یہ حقیقت ہمارے لیے انسان کے طبعی جسم کی موت کے بعد اس کی زندگی کے آئندہ مکمل غیر مادی مرحلے میں تسلسل کے سوال کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیتی ہے، اُس سوال کو جس کا جواب دینا اب تک مشکل ترین امر رہا ہے۔

## اختتامیہ

آیت مبارکہ ۱۹/۸۴: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقًا - ترجمہ: تم لازماً طبق در طبق، یعنی مرحلہ در مرحلہ تشکیل پاؤ گے۔  
یہ ہے مقصد گردش روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

---

اس سیر حاصل تحقیق کے بعد آئیے اب موضوع کو اس کے منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے ایک طائرانہ نظر سے تمام تر جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کائنات کے مختلف مراحل کی تخلیقی کاروائی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ تخلیق کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ حیات ایک بلند تر مرحلے میں داخل ہونے پر نہ ہی اُس خاص سطح سے کبھی نیچے آتی ہے، نہ ہی اُن اقدار میں سے کسی کو ضائع ہونے دیتی ہے جو اس مرحلے پر اس نے حاصل کی ہوں۔ مثلاً تخلیق کے طبعی مرحلے پر اُس مرحلے کی وہ تمام شعوری اقدار جو زمین پر موجود طبعی قوانین کی شکل میں نمودار ہوئی تھیں، اپنے مرحلے کی تکمیل پر مکمل طور پر محفوظ ہو کر برقرار رہ گئیں۔ درحقیقت یہ قوانین زندہ سیارہ زمین نے باریک ترین تفصیل کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ محفوظ کر لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زمین کے عمل فعل یا طریق کار کی ادائیگی میں کوئی بھی سقم نہیں پاتے۔ اس کے بعد، نباتاتی حیات کی تخلیقی مرحلے پر ہر نسل کی شعوری اقدار ایک نوع کی شکل میں اس مرحلے کی مجموعی مقصد کے تحت، ایک بیج کی شکل میں مکمل طور پر محفوظ کر لی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر حیات نے اپنی جسمانی ساخت اور شعوری اقدار یعنی رجحانات اور طریق کار، بیج کے اندر ایک سبب اور نتیجے کے تسلسل کی صورت میں محفوظ کر لی تھیں۔ ان اقدار کے برقرار رکھنے کا مقصد حیات کے تسلسل کو اس کے تمام بھرپور اور وسیع تنوع کے ساتھ یقینی بنانا تھا تا کہ وہ بلند تر تخلیقی مرحلے کے لیے ایک بنیاد کے طور پر کام کرے۔

اگلے تخلیقی مرحلے میں حیوانی حیات نے بھی اپنی اقدار کو ایک علیحدہ نوع کی طرح جرثومہ کی شکل میں برقرار رکھا۔ اس مرحلے میں حیوان نے جبلت کے دباؤ کے تحت کام کیا جو کہ سبب اور اس کے نتیجے کے اصول سے مماثلت رکھتا تھا۔ جانور کا یہ فیصلہ کہ وہ ایک مخصوص جبلت کے دباؤ پر حاوی آ کر دوسرے زیادہ طاقتور جبلی دباؤ کی تعمیل کرے، اس بات کی نشانی تھی کہ حیوانی مرحلے میں حیات، طبعی اور نباتاتی مراحل کے مقابلے میں زیادہ آزاد تھی۔ لیکن کیونکہ حیوانی مرحلے پر حیات مادی سطح پر ہی رہتی ہے اس لیے وہ خود سے آگاہ نہیں ہے۔ اگلے انسانی بلند تر مرحلے پر انسانی ذات ایک مختلف تخلیقی مرحلے میں رہتی ہے۔ اس لیے یہ اپنی شعوری اقدار اپنی ذات یا روح کے 'بیج' یا 'جرثومے' میں محفوظ کر لیتی ہے۔ سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ نوٹ کرنے والا ہے کہ انسانی شعوری ذات سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل میں ہر وجود نے شعوری اقدار ان کی نوعیت میں محفوظ اور منتقل کیں، ذات یا شخصیت میں نہیں۔ یہ اس لیے کہ اُن مراحل میں

حیات خود سے یا اپنی شخصیت سے آگاہ نہ تھی اور مادی علامتوں یا اشکال میں زندہ تھی۔ اسی لیے یہ اپنی اقدار صرف اپنی نوع میں ہی ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقلی کے ذریعے محفوظ کر سکتی تھیں۔

حیوانی مرحلے تک حیات ایک سبب اور نتیجے کے توازن کے ذریعے عمل پذیر تھی اور اس کا مکمل نظام خود حیات نے مادی علامتوں کی شکل میں بیج یا جرثومے کی صورت اپنے تسلسل کے لیے محفوظ کیا تھا۔ مثلاً نباتاتی مرحلے پر ایک آم کے درخت کی منفرد شناخت اس کی نوع اور نسل میں ہوتی ہے، اس کی ذات میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خواہ ایک آم کا درخت ہو یا ایک گندم کا پودا، پودوں میں حیات کبھی خود شناس نہیں ہوتی، اور اس سبب سے یہ کم و بیش ایک میکینیکل سطح پر ہی، سبب اور نتیجے کے اصول پر کام کر سکتی ہے۔ [یہاں یہ واضح کر دیا جائے کہ اس کائنات میں کچھ بھی میکینیکل یا خود کار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایٹم بھی حیات رکھتا ہے اسی لیے یہ اُس تعلق سے عمل کرنے میں آزاد ہے۔ آزادی اور علم شعور کے اوصاف ہیں۔ جتنا زیادہ حیات اپنے مقصد سے آگاہ ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہ خود سے عمل کرنے میں آزاد ہوگی۔] اس لیے نباتاتی مرحلے میں ہر نسل سختی سے اپنی شعوری اقدار کے حصول کے لیے زندہ رہتی ہے اور انہیں مکمل طور پر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں برقرار رکھتی ہے۔ یہ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہے کہ ہر نسل ایک ٹریڈ مارک کی مانند اپنی صورت اور اقدار کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی کی مانند معاملہ حیوانات کے تخلیقی مرحلہ کا بھی ہے۔ حیوانی مرحلہ بھی ایک مادی مرحلہ حیات ہے اور یہ اپنی نسلوں کی شعوری اقدار، نوعیت کے حساب سے اپنے مرحلے کے مجموعی پلان کے تحت قائم رکھتا ہے۔ خواہ یہ ایک گھوڑا ہو یا ایک میمنہ، ہر ایک اپنی اقدار ایک نوع یا نسل کے پیمانے میں برقرار رکھتا ہے۔ طبعی جسم کو شعوری اقدار تشکیل دیتی ہیں، اور شعوری اقدار اسی وجود کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ دونوں حالتوں میں حیات زندہ رہتی اور طبعی وجود کو غیر شعوری طور پر متنوع علامات کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہ سب سبب اور نتیجے کے تسلسل کی پیروی کرتے ہیں۔ بمقابلہ نوعی اقدار کے جو نوع کی شکل میں ان مراحل میں محفوظ کی جاتی ہیں، وہ اقدار جو انسانی مرحلے میں محفوظ رکھی جاتی ہیں وہ شخصی یا ”ذاتی“ ہیں جیسا کہ لفظ ”شعوری ذات“ کے ذریعے زور دیا گیا ہے۔ اگر ہم شعوری ذات کو خارج کر دیں، تو انسانی مرحلے میں ذات یا شخصیت سے متعلق کوئی بھی شعوری اقدار موجود ہی نہ رہیں گی یا خود کو بچا نہیں پائیں گی۔ اس طرح انسانی مرحلے میں شعوری اقدار ہر فرد کے ساتھ یا شعوری ذات کے ساتھ ”ذاتی“ ہی رہنی چاہئیں۔

## ماحصل

ہماری اس بحث سے یہ بات صاف ہوگئی کہ

[اولاً] انسانی ذات اپنی ذہنی جسم یا ذہنی حالت میں خود مختار زندگی گزارتی ہے؛ اور

[ثانیاً] انسانی ذات مر نہیں سکتی نہ ہی یہ ایک ذات سے دوسری ذات میں اُس طرح منتقل ہو سکتی ہے جیسے پودوں اور حیوانات کی

طبعی حیات، کیونکہ انسانی ذات ایک یگانہ و منفرد خود آگاہ ہستی کی طرح زندہ رہتی ہے۔

انسانی مرحلے میں صرف طبعی جسم کی شعوری اقدار ہیں جو قابل انتقال ہیں اور جو موت اور ٹوٹ پھوٹ سے عبارت ہیں۔ لیکن انسانی ذات جو ایک بالکل علیحدہ غیر مادی حالت میں رہتی ہے، قطعاً مر نہیں سکتی کیونکہ یہ تخلیقی طریق کار کے بنیادی قانون کے خلاف ہے جس کے مطابق حیات اپنی حاصل کردہ سطح سے نیچے نہیں آسکتی اور نہ ہی یہ اپنی شعوری اقدار کو ضائع کر سکتی ہے۔

زندگی یا حیات لازماً اپنی نہایت مشکل سے حاصل کردہ اقدار کا تحفظ کرتی ہے، اپنی تمام باریک ترین تفصیل کے ساتھ، کیونکہ بصورت دیگر تخلیقی طریق کار مزید آگے نہیں بڑھ سکتا۔

خود شناسی کے مرحلے سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل دراصل شعوری ذات یا انسان کے ہی تخلیقی مراحل تھے۔ کیونکہ وہ شعوری اقدار جو شعور ذات کے تخلیقی مرحلے سے قبل پیدا کی گئیں، ابتدائی مراحل تھے اور خود آگاہ انسان کے نمودار ہونے کی راہ ہموار کرنا ان کا مقصد تھا، اس لیے وہ سب ایک غیر شعوری یا مادی حالت حیات میں رہتے تھے۔ اس حالت میں حیات جو خود سے آگاہی نہیں رکھتی تھی، پیدائش کے طریق کار پر ترقی پاتی اور منتقل ہوتی رہی۔ انسانی مرحلے پر پہنچ کر حیات اپنے خالق کے وجود سے براہ راست آگاہ ہو گئی اور اپنے ماخذ کی پہچان کے ذریعے یہ اپنے آپ میں داخل ہوئی۔ پھر انسان کے تمام اعمال و افعال اس کی شعوری ذات کے ذریعے سرانجام پانے لگے اُس مقصد کے ساتھ کہ اُس حقیقتِ مطلق کو زیادہ سے زیادہ دریافت کیا جائے جس نے انسان کو خود سے آگاہی دی تھی۔ ایک اور نظریے کے مطابق بھی آدمی مرتا نہیں ہے۔ حقیقت کے اس کے باطن سے جھلکنے کے ساتھ انسانی ذات خود کو پہچانا شروع کر دیتی ہے۔ یہ ہمیشہ کسی دوسری حقیقت کے حوالے سے ہوتا ہے کہ انسانی ذات خود کو جان سکے۔ اس طرح، ایک مرتبہ اپنی ذات کی پہچان ہو جائے تو پھر انسانی روح یا شعوری ذات کوئی تبدیلی قبول نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ موت یا تباہی بھی روح پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ذات کی موت کا مطلب ہوگا حقیقتِ مطلق کی موت یا اُس ماخذ کی موت جس کی وجہ سے ذات پیدا ہوئی اور خود کو جاننے لگی۔

یہ امر ہمیں مزید اس نتیجے کی طرف لے جاتا ہے کہ انسان کی شعوری ذات ایک ایسی حقیقت ہے جو ایک مرتبہ اپنے ماخذ کو جان لینے کے بعد یعنی ”دوسری حقیقت“ کو جاننے کے بعد، کبھی بھی تباہ نہیں ہو سکتی۔

شعور ذات کے مرحلے پر ذات اپنی تمام سوچوں اور اعمال کو باریک ترین تفصیل کے ساتھ اپنے ذہنی آلات میں محفوظ کر لیتی ہے۔ اسی بناء پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بے شک حیوانی وجود مستقلاً تبدیلی سے گذرتا رہتا ہے، لیکن انسانی ذات یا شخصیت اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ انسانی ذات اگرچہ اپنی پیدائش سے بوڑھا پے تک، حیوانی وجود کے ساتھ منسلک ہے، تاہم یہ اپنے تصورات، سوچ و فکر اور اعمال و افعال کو بطور ایک منفرد شخصیت خود مختار طریق پر محفوظ رکھتی ہے۔ اگر شعوری ذات بھی کسی تبدیلی کا ہدف ہوتی تو اس کی سوچ و فکر اور افعال کبھی ریکارڈ ہو کر محفوظ نہ رہتے۔

اس حقیقت کو کہ انسان کی شعوری ذات نہایت احتیاط سے اپنی سوچ و فکر اور افعال کو محفوظ کر لیتی ہے، نامور نفسیات دان، فرائڈ کی تائید و حمایت حاصل ہے جس نے انسانی ذہن پر ایک تسلسل کے ساتھ تجربات کے نتیجے میں یہ دریافت کیا۔ یہاں اس



نکتہ کی وضاحت کر دینا چاہیے کہ فرائڈ کی اصطلاح ”id“ یا ”لا شعور“ جو اس نے انسانی ذہن یا ذات کے متعلق استعمال کی، وہی ہے جسے ہم ”شعوری ذات“ کہ چکے ہیں اور جو ہماری تحقیق کے مطابق انسان کی تمام شعوری کاروائیوں کو محفوظ رکھتی ہے۔

فرائڈ لکھتا ہے: ”id میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کا موازنہ عدم [negation - لا] سے کیا جائے اور ہم اس میں

فلاسفروں کے اُس اصرار سے، کہ زمان و مکان ہمارے افعال کا ایک ضروری حصہ ہیں، استثناء کی کیفیت دیکھ کر حیران ہیں۔ کیونکہ id میں ایسا کچھ نہیں ہے جو وقت کے تصور سے تعلق رکھتا ہو۔ اس میں امتدادِ زمانہ کی کوئی پہچان یا شناخت نہیں ہے [اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو بہت ہی قابلِ ذکر ہے اور فلسفیانہ فکر میں خاطر خواہ توجہ کی منتظر ہے] اور وقت کے گزرنے پر ذہنی طریق کار میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ذہن کے وہ تخلیقی رجحانات جو کبھی id کی طرف جبراً دھکیلے بھی نہیں گئے، اپنی اصل میں لافانی ہیں اور دہائیوں تک وہاں اس طرح برقرار رہتے ہیں جیسے وہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے تھے۔“

فرائڈ کے اس تحریر کا جواب، کہ ہر ایک واقع id میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کاروائی میں وقت کے تصور سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا، بہت ہی سادہ ہے۔ id، یا لا شعور، کا واقعات کو محفوظ کر لینے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب حیات خود کو حیوانی وجود کی موت پر اس سے علیحدہ کر لے تو اس کے بعد بھی اس کا تسلسل یقینی رہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ زمان و مکان کے قوانین صرف اسی کائنات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اگر اس کائنات کے علاوہ جسے ہم جانتے ہیں، کوئی اور بھی کائنات موجود ہو، جیسا کہ سائنس فی زمانہ ہمیں multiverse کی تھیوری کے ذریعے اشارہ دے رہی ہے، تو وہ یقیناً اس کائنات کے زمان و مکان کے نظام سے باہر اپنا وجود رکھتی ہوگی۔ ہماری موجودہ زندگی میں ہمارا ہر عمل زمان و مکان کے نظام کے اندر ہی بار آور/ بارز ہوتا ہے جو ایک ایسا نظام ہے جو اضافی ہے۔ لیکن اگر فرائڈ کے مطابق، ہم ضرور ایک ایسی ذہنی حیات رکھتے ہیں جو زمان و مکان کے اثر سے آزاد ہے، تو یہ ہمارے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ انسانی ذات طبعی وجود کی موت کے بعد بھی زندہ رہنا جاری رکھے گی۔ طبعی وجود کی موت تو بذاتِ خود زمان و مکان کے اثر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن یا ذات زمان و مکان کی اقلیم سے بلند رہتی ہے، جیسا کہ فرائڈ نے بھی اپنے تجربات سے دریافت کیا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ذات کو موت نہیں آسکتی؛ یہ صرف طبعی وجود کو آتی ہے جو ایک مادی حالت میں زندہ ہے اور زمان و مکان کی حدود کا اسیر ہے۔

یہاں پھر ایک بار حضرت علامہ اقبال کی فکرِ عمیق سے کچھ جو اہر پارے پیش ہیں جو ہمارے موضوع کو اجاگر کرتے ہیں:

”ارض و سماء، پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان

[time and space] کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائیگا۔ کیا معلوم ارض کیا ہوا اور سماء

کیا ہو۔ یادوںوں ایک ہی ہوں۔ اسی لیے تو فرمایا کہ [۱۴/۴۸]: یومٌ تُبدَلُ اِلَیْهِ اَرْضٌ غَیْرُ اِلَیْهِ اَرْضٌ وَ السَّمٰوٰتُ - جس دن یہ ارض

و سماوات بدل جائیں گے]۔ شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں دونوں چیزیں

باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔“

قارئین، یہاں حضرت علامہ مراحل حیات کے تناظر میں درجہ بدرجہ بلند تر ہوتی ہوئی شعوری اقدار ہی کی بات کر رہے ہیں اور اس امر کے امکان کی تصدیق فرماتے ہیں کہ آئندہ مرحلہ حیاتِ زمان و مکان کے قوانین سے ماوراء اور بلند تر سطح پر قائم ہوگا۔

ذات یا شخصیت کا واقعات اور خیالات کو محفوظ کر لینا مزید ظاہر کرتا ہے کہ وہ ساز و سامان یا وہ نظام جس کے ساتھ ذات قریبی طور پر وابستہ ہے، طبعی وجود کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں زیر بحث لایا گیا، یہ اس وجہ سے ہے کہ طبعی وجود مسلسل تبدیلی کی زد میں رہتا ہے۔ ہر تین سال بعد وجود کے خلیات مکمل طور پر نئے خلیات سے بدل جاتے ہیں اور بعد ازاں ایک خاص عمر تک پہنچنے پر وہ زوال اور شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اور آخر کار وجود کے بکھر جانے پر منج ہوتے ہیں۔ تاہم، ہم ذات کے ذہنی نظام میں کوئی تبدیلی یا کمتری کا رجحان نہیں پاتے، جہاں فرائڈ کے مطابق دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی تمام واقعات، خیالات اور اعمال اس طرح محفوظ کر لیے جاتے ہیں گویا کہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے ہوں۔

## آخری فیصلہ

قارئین، ہم حیات کے اہم ترین پہلوؤں پر تحقیق کر چکے ہیں اور نتیجتاً کچھ بہت اہم فیصلوں تک پہنچے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نباتاتی اور حیوانی مراحل تخلیق پر حیات کی شعوری اقدار بیج اور جرثومے کی صورت میں محفوظ کی گئی ہیں۔ اور یہ کہ اقدار کے اس تحفظ کا مقصد اُن مراحل میں حیات کے تسلسل کو یقینی بنانا تھا۔ اُن مراحل میں حیات قابل انتقال تھی کیونکہ حیوانی مرحلے تک حیات ابھی خود سے آگاہ نہ تھی اور اسی لیے مادی حالتوں میں موجود تھی۔ یہ اپنی اقدار صرف عمل پیدائش کے ذریعے بچا سکتی تھی۔ تاہم انسانی مرحلے میں انسانی ذات ناقابل انتقال تھی۔ اسی لیے یہ اپنے اُس حیوانی وجود کی موت کے بعد بھی حیات کا تسلسل قائم رکھ سکتی تھی جو تبدیل ہونے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے کا ہدف تھا۔

نباتاتی اور حیوانی مراحل میں حیات خود آگاہ نہ تھی اور اس لیے ایسی اکائیوں کی تنظیم میں رہتی تھی جو طبعی وجود کے ذریعے اپنی اقدار باسانی منتقل کر سکتی تھیں۔ مثلاً، نباتاتی مرحلے میں پودے کا بیج مکمل پودے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوانی مرحلے میں جرثومہ مکمل طور پر حیوان کی جبلی اور شعوری اقدار کو محفوظ رکھتا ہے اور دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ انسانی مرحلے میں اگرچہ انسان کا طبعی وجود بھی جرثومہ کے ذریعے دوبارہ پیدا ہوتا ہے، مگر شعوری ذات جو اپنی ذہنی حالت میں رہتی ہے اور حیوانی وجود سے بالکل الگ ہے، نہ دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی بیج یا جرثومے کے ذریعے منتقل ہو سکتی ہے۔ شعوری ذات ایک یگانہ ہستی کے طور پر نمودار ہوتی ہے جہاں اس کے تمام خیالات، نظریات اور اعمال مکمل محفوظ رہتے ہیں جیسے کہ درخت کے پتے، ٹہنیاں اور تنا بیج کے اندر رہتا ہے۔ تخلیق کا اولین اصول ہمیں



لازمًا انہی صفات کا حامل ہونا چاہیے جو روح میں موجود ہیں۔ اس سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ صرف ایسے آئیڈیل یا نظریے جو انسانی ذات کی صفات پر مبنی ہوں، ذات کو خود کی شناخت دے کر تسکین دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

آئیڈیل، یا قابلِ تقلید تصویراتی پیکر، انسانی ذات کا نصف ہے اور یہ روح میں اُن دواجزاء کی مانند رہتا ہے جو ایک بیج کی اکائی میں رہتے ہیں۔ اگر ہم آئیڈیل کو زندگی سے نکال لیں، انسانی ذات قائم نہیں رہ سکتی۔ یعنی یہ خود کو کبھی جان ہی نہیں سکتی۔

اگرچہ انسانی تقاضہ اُس خالق کی تلاش اور اُس سے محبت ہے جس کا عکس وہ خود کے اندر پاتا ہے، پھر بھی وہ ابھی تکمیل کے سفر میں ہے۔ اور وہ اپنی آزادی کے تحفے کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ اور کچھ غلط آئیڈیل منتخب کر کے ان کی پیروی اختیار کر سکتا ہے۔ انسان کو خالق نے اپنے پیغام برون اور انتہائی باشعور انسانوں کے ذریعے راہنمائی مہیا کی ہے جنہیں اُس نے تخلیقی طریق کار کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو مختلف نظریات کا اتباع کرتے ہیں دراصل انسانوں کی ایک مختلف صنف کی حیثیت میں زندہ ہیں۔ تخلیقی طریقہ کار کے مطابق صحیح نظریہ صرف ایک ہی ہے، ایسے ہی جیسے کہ سچائی صرف ایک ہی ہوتی ہے، لیکن جھوٹ کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ لہذا شعوری روشنی کا آئندہ مرحلہ ان روحانی اقدار پر تعمیر یا شروع ہوگا جو صحیح نظریے کے متبعین نے حاصل کی ہوگی۔ تمام دوسری اصناف کو ایک طبعی نتیجہ کا سامنا کرنا ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں وہ جو موجودہ مرحلہ حیات میں اندھے رہے اُس روشنی کو نہیں دیکھ سکیں گے جو آئندہ آئیڈیل بلندی پر مرحلے میں نمودار ہوگی۔ خالق کا فرمان ہے:

”۷۱/۱: ومن کان فی ہذہ اعمىٰ فہو فی الآخرۃ اعمىٰ۔۔۔“ ترجمہ: جو اس زندگی میں اندھے رہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھے ہی ہوں گے۔

ایسے لوگوں کو خود کو اُس شعوری روشنی تک پہنچنے کے قابل بنانے کے لیے سخت ذہنی اور روحانی اذیت سے گزرنا ہوگا۔ یہ اس دنیا میں اُن بہت سی حیوانی اصناف کی مانند ہیں جو شعوری طور پر اندھی ہوتی ہیں، اگر اُس شعوری روشنی سے اُن کا موازنہ کیا جائے جو انسان کو عطا ہوئی ہے۔

غلط نظریات جو انسانی ذات کی روحانی اقدار کی نفی کرتے ہیں، انسانی ذات کو اندھا رکھتے ہیں۔ ایسے نظریات کے پیروکار تخلیق کے اُلٹے طریق کار [Reverse process] پر یقین کرتے ہیں، یعنی وہ خود کو مادی قوتوں کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جو اپنی روحوں یا ذات کو ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اتار دینے کا نظریہ یا رجحان رکھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ آئندہ مرحلے کی روحانی اقدار کو کبھی حاصل نہ کر پائیں گے۔ خالق کا فیصلہ تو یہ ہے:

”۱۶۷/۲: وما ہم بخارجین من النار۔۔۔“ ترجمہ: پھر وہ کبھی اُس آگ سے باہر نہ آ سکیں گے۔

یہ تخلیقی عمل کا بنیادی اصول ہے کہ حیات صحیح شعوری اقدار پر شروع ہو اور پیش قدمی کرے۔ اگلے مرحلے کی شعوری روشنی خالق کی

عظمت و شان کی روحانی روشنی ہے۔ اور اس طرح انسانیت کا صرف وہ حصہ جس نے خالق پر بھروسہ کیا، اسی کی ذات کو اپنا مطلق آئیڈیل بنایا، اور اپنی ذات کی درست سمت میں افزائش کی، آئندہ بلند تر مرحلے میں شان و عظمت کی روشنی دیکھ سکے گا۔

لہذا ان لوگوں کے لیے یہی درست وقت ہے جنہیں اس دنیاوی زندگی کا تحفہ ملا ہے کہ وہ زندگی کے آئندہ سفر میں ایک ہموار پیش قدمی کرنے کے لیے صحیح نظریے کا انتخاب کریں۔ علامہ نے اپنی فکر عمیق سے انسانِ کامل کے لیے ایک معیار متعین فرمایا تھا۔

براہِ کرم لفظ کافر کو انتہائی معنی میں تحقیر کی بجائے نظریاتی تناقض میں لیتے ہوئے غور فرمائیں، ممنون ہوں گا:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے  
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

والسلام۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔

-----